مُعَاصِرِین

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

مُعَاصِرِین

حضرت مولانا عبد الماجدؒ دریا بادیؒ

(ترتیب)

حکیم عبد القوی دریا بادی

(جملہ حقوق محفوظ)

سنہ ۱۳۹۹ھ سنہ ۱۹۷۹ء

بار اوّل

تعداد ۱۲۰۰

کتابت .... عبدالمجید صدیقی شنہاروی

طباعت .... کوہ نور آرٹ پریس پرائیوٹ لمیٹڈ۔ کلکتہ

صفحات ۲۳۲

قیمت .... ۲۰ روپے

مطبوعہ زیرنگرانی : علیم اللہ صدیقی، صدیقیہ اردو آرٹ - کلکتہ - ۷۰۰۰۱۶

باہتمام

منظور علی لکھنوی

(طابع وناشر)

ادارۂ انشائے ماجدی ۱۴۷ رابندر سرانی کلکتہ ۷۳

(ملنے کے پتے)

حکیم عبدالقوی کچہری روڈ لکھنؤ

انوار بک ڈپو ۱۸/۹۹ لورچیت پور روڈ کلکتہ ۱
عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴ لورچیت پور روڈ کلکتہ ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ

معاصرت کا حق ۸۰، ۸۲ سال دنیا میں بسر کر کے اگر کسی کو نہیں پہنچتا، تو پھر کسی کو بھی نہیں پہنچ سکتا، اور بات کے لیے منھ کھولنے کا حق اگر ایک پیر فرتوت کو نہیں پہنچتا تو کس کو ملتا؟

معاصرین کے سرسری خاکوں میں ذکر آگیا ہے اپنے قریب ترین عزیزوں کا۔ نیز ان بزرگوں کا جو کسی بھی حیثیت سے اپنا اثر ڈال گئے اپنی شخصیت سے اس ناکس پر!

اس خود گزشت کے پڑھنے والے ایک بات ضرور یہ یاد رکھیں کہ لکھنے والا ۱۰۱ برس کی مدت تک یعنی ۱۷ برس کے سن سے ۲۰ برس کی عمر تک مذہب کی قید سے بالکل ہی آزاد رہا ہے، اور باتیں لامذہبوں اور دہریوں (زیادہ صحیح لاادریوں) کی سی کرتا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ ایک آدھ صاحب رہ گئے۔ سنہ وفات کا صحیح پتا بالکل نہ چل سکا۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے:۔

تینتالیس ۴۳ بڑے:۔

اُنتیس ۲۹ برابر والے:۔

آٹھ چھوٹے:۔

کبھی کسی ایک عنوان کے اندر دو دو صاحب آگئے اور اس طرح کل تعداد اسی ہوگئی ہے بیشتر حصہ مرحومین کا ہے، صرف چار پانچ ماشاء اللہ زندہ ہیں۔ (حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

عموماً اہل تذکرہ کا تذکرہ صرف شخصیتوں کے تحت رکھا گیا ہے، لیکن کسی صاحب تذکرہ کا کوئی گھریلو نام دیا گیا ہے۔ بجائے اس نام کے، اور کسی شخصیت کی زندگی کے کسی خصوصی پہلو کو گھریلو زبان میں کچھ اور کہا گیا ہے۔ چنانچہ "ڈاکٹر عبد العلی" کو محض "ڈاکٹر صاحب" یا چودھری خلیق الزماں" کے بجائے صرف "چودھری صاحب"، مولانا ابوالحسن علی کو صرف "علی میاں" کہا گیا ہے۔ بعض عنوانات میں ان کا محض خصوصی پہلو بالکل ظاہر رہا ہے۔

عبد الماجد

۱۷ مئی ۱۹۷۴ء

دریاباد۔ بارہ بنکی

لہ کتاب کی اشاعت کے وقت صرف دو صاحب ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں (۱) مولانا مودودی (۲) مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

۷۸۶

عرض مرتب

"معاصرین" مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے اپنی علالت (فالج) کے دوران اردو اکاڈیمی یوپی کو اشاعت کی غرض سے حوالہ کی تھی اور اس کی کمیٹی نے اسکی اشاعت کو منظور کر لیا تھا توقع تھی کہ چند ماہ میں وہ اس کے زیر اہتمام شائع ہو جائے گی۔ مولانا کی وفات ۶ جنوری ۱۹۷۷ء تک اسکی طباعت کیا معنی کتابت کا بھی آغاز نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اکاڈیمی نے اپنے اشاعتی پروگرام میں اسے شامل کرنے کا اعلان کیا لیکن بعض وجوہ کے پیش نظر مولانا کے ورثا کو کتاب کا مسودہ اکاڈیمی سے واپس لینا پڑا اور اسکی اشاعت کا بیڑا مولانا مرحوم کے نادیدہ مخلص حاجی منظور علی صاحب لکھنوی، مالک رائل انڈین ہوٹل کلکتہ نے اپنے مخلص رفیق اور مولانا کے ہم وطن بلکہ ہم محلہ، مزاج شناس انتہائی مخلص ہم نشیں محمد صدیق دریابادی کی تحریک پر اٹھایا۔ حاجی منظور علی صاحب اس سے قبل مولانا کی ایک کتاب "خطبات ماجد" بڑے اہتمام و نفاست سے شائع کرا کر اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے۔ اس کتاب کی ترتیب میں محمد صدیق دریابادی نے انتہائی عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس دوسری کتاب "معاصرین" کو اعلیٰ پیمانہ پر شائع کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ اچانک ۳۰ اپریل کو ایک مختصر لیکن شدید علالت کے باعث وہ راہی باغ جناں ہوگئے اور کلکتہ ہی میں مدفون ہوئے اِنّا للہ و انا الیہ راجعون! ان کی وفات کے بعد کتاب کی طبع و اشاعت اور اس سلسلے کی تمام ذمہ داریوں کا بار حاجی منظور علی صاحب پر آپڑا۔ انھوں نے اپنی انتہائی کاروباری مصروفیتوں کے باوجود اس کام کو باحسن وجوہ انجام دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی سعی مشکور ہوئی اور "معاصرین" ان کے قائم کردہ اشاعتی ادارہ کے "نقشِ ثانی" کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آگئی۔

حکیم عبدالقوی دریابادی

مدیر "صدق جدید" لکھنؤ

تینتالیس۴۳ بڑے

والدین

(والد متوفی ۱۹۱۲ء - والدہ متوفیہ ۱۹۴۱ء)

والد ماجد کی وفات ۱۹۱۲ء میں ہوئی، جب میں ۲۰ سال کا ہو چکا تھا۔ اور والدہ ماجدہ کی ۱۹۴۱ء میں جب میں ۴۸ سال کا تھا۔ معاصرین کا آغاز انھیں کے متبرک ذکر سے کرتا ہوں کہ علاوہ برکت کے معاصرت کا اطلاق بھی ان سے بڑھ کر اور کس پر ہوگا۔

والد ماجد مولوی حاجی عبدالقادر کی ولادت ۱۸۴۷ء میں ہوئی، جب والیِ اودھ امجد علی شاہ تھے۔ اس زمانے کو عوامی زبان میں "نوابی" کہا جاتا ہے۔ درسی تعلیم وقت کے مشہور دارالعلوم فرنگی محل (لکھنؤ) میں ہوئی۔ اُس وقت خاندان لکھنؤ میں رہتا تھا نہ کہ دریاباد میں تعلقات فرنگی محلیوں سے یوں بھی ہم لوگوں سے بہت ہی زائد تھے، بالکل مثل عزیزوں کے۔ حد یہ ہے کہ اس وقت پردے کی شدید پابندیوں کے باوجود ان لوگوں سے پردہ نہ تھا۔ خصوصاً میرے نانا اور بڑے دادا مولوی حکیم نور کریم کی اولاد سے۔ فرنگی محل کی جو شاخ پوتوں والی کہلاتی ہے (نہ کہ نواسوں والی) اس شاخ سے تعلقات خصوصی تھے، تدریس اور بیعت دونوں کے۔ شمس العلماء مولوی ابوالحیاء محمد نعیم اس شاخ کے روشن ستارے تھے۔ علم خصوصاً فقہ اور تقویٰ و احتیاط میں اپنے نظیر آپ۔ والد ماجد انھیں سے پڑھے، اور ان سے قادری سلسلے میں بیعت بھی ہوئے۔ عربی کا نصاب نظامی اور اردو اور فارسی بھی لازمی طور پر پڑھی ہوگی۔

سلیم الفطرت اور شائق علم شروع سے تھے۔ کم سنی ہی میں چھوٹی سی ملازمت مُدرّسی کی مل گئی۔ اپنے ذاتی شوق سے انگریزی کا بھی مطالعہ اتنا کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح کام چلا لیتے تھے

نوابی دور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ پر ختم ہو چکا تھا۔ اب ۱۸۵۷ء کے بعد باقاعدہ انگریزی راج قائم ہو گیا تھا۔ یہ کسی چھوٹے سرکاری اسکول میں اپنے ضلع بارہ بنکی میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے۔ پھر کسی طرح ضلع ہردوئی میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں کسی انگریز افسر کو نجی طور پر فارسی پڑھائی اس نے خوش ہو کر انھیں ایسا سرٹیفکٹ دے دیا جس سے یہ بجائے تعلیمی صیغہ کے صیغہ عدالت میں منتقل ہو آئے۔ اور پھر جلدی ترقی کر کے تحصیل داری کے عہدے پر پہنچ گئے۔ سندیلے کی تحصیل داری کئی سال تک بڑی نیک نامی، خوش انتظامی اور ہر دل عزیزی کے ساتھ کی اور حکومت اور رعایا دونوں کو مطمئن بلکہ خوش رکھا۔ انگریز افسر سال میں دو بار کام کی رپورٹ پیش کیا کرتے تھے۔ ہر مرتبہ ان کے کام کے لیے بہتر سے بہتر رپورٹ ہوتی تھی۔ تحصیل داری کا عہدہ اُس زمانہ میں کلکٹر کے بعد ضلع کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ اور بڑی ہی ذمہ داری کا ہوتا۔ یہ اپنا سارا وقت نماز، روزہ تلاوت و اوراد کے بعد سرکاری کام اور لوگوں کی خاطر مدارات میں صرف کرتے تھے۔ بڑے مروّت والے، فیاض، سیر چشم و متواضع تھے۔ تحصیل دار کا عہدہ اُس وقت بڑے رعب و دبدبے کا ہوتا تھا۔ یہ برتاؤ سے حاکم سرے سے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے سے بڑی کشادہ جبینی سے ملتے تھے، اور غصہ گرمی کرنا، ڈپٹنا، جھڑکنا تو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ ہر طبقہ میں ہر دل عزیز رہے۔ اپنی جگہ مذہبی عقائد میں بڑے راسخ، لیکن اس مذہبیت اور دین داری کے باوجود تعصب کسی سے بھی نہیں۔ نہ "وہابی" سے، نہ "بدعتی" سے نہ "نیچری" سے نہ "رافضی" سے نہ "خارجی" سے میل جول سب ہی سے۔ ہندوؤں سے بھی خلا ملا۔ سزا دینے کو اپنے امکان بھر بہت ٹالتے۔ جہاں تک ہوتا مقدمات میں مصالحت و راضی نامے ہی کرا دیتے۔ میری جب ۱۸۹۲ء میں پیدائش ہوئی تو لکھیم پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ۴۰۰ کے گریڈ میں۔ اُس وقت روپئے کی قیمت آج ۱۹۷۴ء سے کم سے کم ۱۰، ۱۲ گنی زائد تھی۔ اُس زمانے میں ۴۰۰ آج ۵ ہزار کے برابر کہیے۔ اور اس حساب کو مبالغہ نہ خیال فرمائیے۔

گونڈہ، بستی، گورکھپور، فیض آباد ہوتے ہوئے ۱۸۹۹ء میں سیتاپور آ گئے۔ اور اس وقت

تا۔۔کی باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ گریڈ بھی اب پانسو کا ہو گیا تھا۔ گھر میں اچھی خاصی خوش حالی تھی۔ دو دو گھوڑے اور گاڑیاں (موٹر کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا) دو دو خدمت گار، دو چھوکرے۔ ایک باورچی۔ ایک بہشتی، ایک چوکیدار، ایک اہیر، گائے، بھینس، بکری کے لیے۔ کل ملا کر ۱۰۰۸ ملازم، دو سرکاری چپراسی۔ ماماؤں، اناؤں، کھلائیوں کی ایک پوری پلٹن۔ گھر میں تین اولادیں تھیں، دو لڑکے ایک لڑکی، میں تینوں میں چھوٹا۔ اب اسکول میں میرا داخلہ ہو گیا۔ گھر پر ایک مولوی صاحب چوبیسوں گھنٹوں کے لیے اتالیق شروع ہی سے موجود تھے۔ اب ایک ماسٹر بطور پرائیوٹ ٹیوٹر کے بھی آنے لگے۔ سول لائنس میں ایک اچھی کوٹھی مع بہت بڑے باغیچے کے راجہ صاحب محمود آباد کی ملک کرائے پر تھی۔ ساتھ میں ایک چچا زاد بھائی بھی رہتے تھے۔ آپس میں خوب میل جول، دل ایک دوسرے سے کھلے ہوئے۔ دریاباد، سندیلہ، بانسہ وغیرہ کے عزیزوں سے بھی خط و کتابت برابر رہتی۔ کبھی کبھی یہ لوگ بطور مہمان آتے بھی رہتے۔ اور ان کے آنے پر خوب چہل پہل ہو جاتی۔

والد کے پاس پڑھے لکھے لوگ بھی آتے رہتے، فلاں شاعر، فلاں ادیب، فلاں حکیم، فلاں ڈاکٹر، کوئی عالم، کوئی درویش۔ کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا۔ ابھی ریاض خیرآبادی 'ریاض الاخبار' والے چلے آرہے ہیں، ابھی طپش دہلوی ثم لکھنوی (سابق ایڈیٹر اودھ اخبار) اور میں علمی، ادبی چرچوں اور مذہبی سیاسی بحثوں سے بے خبر نہ رہتا۔ بعض حکام بھی بڑے علمی و ادبی مذاق کے آجاتے۔ اور ان سے رونق اور بڑھ جاتی۔ مثلاً سید افتخار حسین بی۔اے کاکوروی ایک ڈپٹی کلکٹر، بڑے خوش مذاق، اور انگریزی اور اردو دونوں میں برق تھے۔ اور ایک منشی جوالا پرشاد برق بھی، ڈسٹرکٹ و سشن جج مترجم رومیو جولیٹ اور ایک مدت تک سید محمود (پسر سرسید اور مشہور سابق جج ہائی کورٹ) پڑوس میں رہے۔ والد کی مرنجان مرنج طبیعت اکثر ہندوؤں کو بھی کھینچ لاتی۔ اور مسلمان رئیسوں کے علاوہ ہندو رئیسوں کے ہاں سے بھی دعوتوں، ضیافتوں اور تحفے تحائف کا سلسلہ بھی برابر قائم رہتا۔

بچازاد بھائی مولوی عبدالحلیم اکثر بڑے اخبار یئے تھے اور کتابیں بھی خدا معلوم کہاں کہاں سے لے آتے، ان سے خوب مستفید ہوتا رہتا۔ اردو کا روزنامہ اودھ اخبار اور ہفت روزہ ریاض الاخبار (گورکھپور) ایک انگریزی سہ روزہ ایڈوکیٹ (لکھنؤ) اور دو تین رسالے خود ہمارے ہاں آتے۔

ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد (۱۹۰۵ء) میں مرحوم شہر کے میونسپل سکریٹری بھی مشاہرے پر مقرر ہو گئے۔ آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ اور اس طرح قیام ۱۹۱۰ء تک یہیں رہا۔ سیتاپور بالکل اپنا وطن ہو چکا تھا، اور میں نے پرائمری کلاس سے لے کر دسواں تک یہیں پاس کیا۔ اسکول اور اسکول فیلڈ دونوں اپنی ہی گھر کے کمرے اور صحن معلوم ہوتے تھے۔ کھیلوں میں خصوصی دلچسپی فٹ بال سے تھی۔ (ہاکی اس وقت تک آئی نہ تھی) اعلا کھلاڑی کبھی نہ بن سکا ہاں اوسط درجے کا سمجھا جاتا تھا۔

۱۹۱۰ء میں ایک عزیز تعلقدار ضلع بارہ بنکی کے ہاں نائب ریاست ہو کر لکھنؤ آ گئے، اور قیصر باغ میں رہ کر لشتم پشتم ڈیڑھ دو برس گزارے پھر مستعفی ہو گئے۔ پانچ سال کا معاہدہ تھا ۳، ½۳ برس کی رقم کئی ہزار کی مل گئی۔ والدہ و ہمشیر کو لے کر حج کو چلے گئے، اور اللہ نے قبولیت اس درجہ عطا کی کہ عرفات کی حاضری دے کر منیٰ ہی میں تھے کہ وقت موعود ہیضے کی شکل میں آ گیا، اور دو دن کی بیماری کے بعد ۱۳ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، جنازہ مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے زیر سایہ رکھا گیا، اور جسد خاکی کو جگہ جنت المعلیٰ میں عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ کے پائین میں ملی۔ مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے قطعہ تاریخ وفات میں کہا ؎

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے
"شغل" ہی میں نکلی تاریخ وفات
۱۳۳۰ھ

غیب کا حال کسی کو کیا معلوم، بہ ظاہر تو وفات اولیاء اللہ کی سی نصیب ہوئی، مغفرت

اور مقبولیت کے اتنے اسباب بہت کم اکٹھے ہوتے ہیں۔

والدہ ماجدہ

والدۂ ماجدہ بی بی نصیر النساء (۱۸۵۲ء تا ۱۹۴۱ء) شادی سے قبل اپنے شوہر کی چچازاد بہن تھیں، بنت مولوی حکیم نور کریم صاحب۔ ابتدائی قیام زیادہ تر لکھنؤ ہی میں گزرا۔ بڑی صابر، شاکر، غم خوار، تہجد گزار، عبادت گزار تھیں۔ اپنی پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں، شادی کے بعد عموماً پردیس پردیس شوہر کے ساتھ رہا کیں۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد وطن آتیں اور دو ڈھائی مہینے قیام کرتیں۔ گھر آتیں تو کنبے والوں، بستی والوں کا خیال کر کے جاتیں، ایک بہن غریب تھیں، اُن کا خاص طور پر خیال رکھتیں۔ آپس کے جھگڑے فسادوں کو اکثر طے کرا کے جاتیں۔ برائے نام خواندہ تھیں، اٹک اٹک کر تلاوت شریف کرتیں اور میری یاد میں اشراق چاشت، اور تہجد پابندی کے ساتھ پڑھتیں۔ نفلی روزے بھی اکثر رکھا کرتیں۔

گھر میں تمدن شہری نہیں، قصباتی رنگ کا تھا۔ شرم، حیا کا انتہائی لحاظ۔ پردہ آواز تک کا تھا اور نامحرموں سے انتہائی سرے کا۔ چند قدم کا بھی طے کرنا ڈولی میانے کے نا ممکن (اب یہ سواریاں دیکھتے دیکھتے ناپید ہوگئیں۔ کوئی انھیں کیونکر بتائے سمجھائے) شریف سے شریف بیبیوں سے بھی میل جول، جب تک وہ پہلے سے برادری کی نہ ہوں ناممکن۔ سیتاپور میں ایک سیدانی بڑے اونچے اور بہت بڑے گھرانے کی سڑک بیچ، مہینوں ملاقات کی تمنا میں رہیں، اور مدتوں ان کی طرف سے سلسلۂ نام و پیام رہا، لیکن مرحومہ کسی طرح اس کی روادار نہ ہوئیں، آخر ایک بار وہ زبردستی، اچانک آ اُتریں۔ ہماری چچی بے چاری بیوہ ہونے کے ساتھ غریب بھی تھیں۔ والدہ ہماری گھر کا خرچ بات انھیں کے ہاتھ سے کراتیں اور انھیں اُن کی غربت کا احساس ہی نہ ہونے دیتیں۔ ہر طرح با اختیار وہی نظر آتیں۔ گھر میں اچھے اچھے کھانے روزمرہ پکتے رہتے اور دعوتیں ضیافتیں بھی آئے دن ہوتی رہتیں۔ مزاج میں فیاضی اس درجے کی تھی کہ بارہا اپنے سامنے سے کھانے کی اچھی چیزیں کسی غریب عزیز یا پڑوسن کو اٹھا کر دے دیتیں۔

۸۰، ۸۲ سال کا سن ہوگا کہ اپنے بڑے لڑکے (مولوی عبدالمجید ڈپٹی کلکٹر) کے پاس فیض آباد میں تھیں کہ بیمار پڑیں اور ۴، ۵ دن کی علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ یہ ننگِ خاندان آخری وقت سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتا رہا۔ دریاباد لاکر نمازِ جنازہ بھی خود ہی پڑھائی، اور رو رو کر مغفرت کی دعا کی۔

باپ کو تو اپنی نافرمانیوں سے آخر تک ناراض رکھا۔ ماں کی تھوڑی بہت خدمت شاید بن سکی ہو۔ اللہ اُس کو اگر قبول سے نواز دے، تو زہے کرم!

حکیمُ الاُمّت رح

(متوفی ۔ ۱۹۴۳ء)

بزرگ میں نے اپنی عمر میں بہت دیکھ ڈالے اور تذکرے بھی بہتوں کے اس تفصیل و استناد سے سُنے کہ گویا انھیں بھی دیکھ لیا۔ عابد و زاہد بھی، چلّہ کش و مرتاض بھی، صاحبِ کشف و کرامات بھی، ان میں یقیناً بہت سے اچھے لوگ بھی ہوں گے۔ اللہ کے برگزیدہ، جنّتی اور مغفور، لیکن مُصلح، مُربّی، اصلاح کرنے والا، اور تربیت سے لگانے والا، حضرت تھانوی کا مثیل و نظیر کوئی نظر سے نہیں گزرا، اور نہ سُننے میں آیا۔

شیخ کی تلاش، جب سے میں از سرِ نو مسلمان ہوا (تقریباً ۱۹۲۰ء سے) جب ہی سے تھی۔ جس کا نام سُنتا، اس کی طرف لپکتا۔ اور اسی ہوس میں ایک مشہور شیخ سے بیعت بھی کرلی۔ حضرت تھانوی کا شروع شروع بالکل معتقد نہ تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی اختلافات کی بنا پر دل کو آزردگی سی تھی۔ اور مُریدین نے تشدد کے وہ وہ قصے بیان کر رکھے تھے کہ نام سے وحشت ہونے لگی تھی۔ ۱۹۲۶ء تھا کہ ایک محترم دوست (سید مقبول حسین وصل بلگرامی) نے حضرت کے کچھ چھپے ہوئے وعظ پڑھنے کو دیے اور کہا کہ تجربۃً ہی ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ بے دلی کے ساتھ اس پر عمل شروع کیا، لیکن اب کیا بیان ہو کہ پہلی ہی نشست میں دل لگنے لگا، اور ایک ایک بات دل میں اُترنے لگی! مولانا کا رنگ صوفیوں، عارفوں، سے الگ نظر آیا۔ شوق بڑھا، وعظ پر وعظ لے کر، مانگ کر پڑھے، اور بے اختیار خط و کتابت شروع کر دی۔ سارا قصہ طول طویل ہے اسے چھوڑیے۔

جولائی ۱۹۲۸ء میں تھانہ بھون حاضری کی اجازت مل گئی۔ آمد و رفت شروع ہو گئی —— دیکھا تو دید شنید سے بھی بڑھ کر رہی اور زیارت سماعت سے کہیں بہتر نکلی۔ کشش اس درجے کی کہ

طبیعت اس سے ہرگز نہ اُکتائیے۔ اور بن جانے پر رخصت کا جی ہرگز نہ چاہے — تھانہ بھون ایک پرانا قصبہ شیخ زادوں کا ضلع مظفر نگر میں ہے۔ لکھنؤ سے جائیے تو سہارن پور ہو کر۔ اور فاصلہ سہارن پور سے کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا، اتفاق سے کچھ ہی روز بعد بھائی صاحب کا تبادلہ سہارن پور کا ہو گیا۔ اور اس سے قدرتاً سفر اور قیام دونوں میں بڑی سہولت ہو گئی۔ اور سفر بار بار ہونے لگا۔ بھائی صاحب کا قیام سہارن پور میں ۴، ۵ برس رہا۔ اور میرا سفر تھانہ بھون کوئی ۱۵، ۲۰ بار تو ضرور ہوا، کبھی مختصر دو ایک دن کا، اور کبھی طویل مہینے سوا مہینے کا۔ مختصر میں حضرت مولاناؒ کا ذاتی مہمان ہوتا اور طویل میں ایک مکان مستقل لے لیتا۔ کبھی تنہا ہوتا اور کبھی رفیقۂ زندگی کو رفیق سفر بنا لیتا خیر میرے لطف سفر کا تو کہنا ہی کیا، گھر والی بھی ساتھ جا کر بڑی ہی محظوظ و مسرور ہوتیں۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ والدۂ مرحومہ اور ہمشیر مرحومہ وغیرہ سارے گھر بار کو سہارن پور سے لے کر گیا، اور سب بہت خوش آئے۔

سنہ ۱۹۲۸ء سے سنہ ۱۹۴۳ء (حضرت کا سال وفات) تک ۱۵، ۱۶ سال، سلسلہ آمد و رفت کا برابر رہا، اور مراسلت بھی اچھی خاصی جو ہوئی وہ اس کے علاوہ۔ اخیر کے دو چار سال حضرت اپنی علالت و نقاہت کے باعث لکھنؤ دو تین بار تشریف لائے۔ یہ ایک ذریعہ مستزاد ہو گیا۔ میں دریاباد سے اکثر سفر کر کے لکھنؤ حاضری دے لیتا تھا، اور ان گھڑیوں کو اپنی زندگی کی بہترین ساعتوں میں سمجھتا ہوں اور اپنی قسمت پر خود ہی رشک کر لیا کرتا ہوں۔ آہ، وہ دن جو اب کبھی نہ آئیں گے!۔

حرم شریف اور حرم کعبہ کو چھوڑیے، مدینۂ منورہ کے بعد ایسی لطافت، ایسی نظافت، ایسی نورانیت اور کہاں۔ کیسی اُلٹی سمجھ والوں نے حضرت مولاناؒ کو "خشک" مشہور کر دیا۔ اور اس شہرت کا ایک سبب تو خود حضرت کے مُریدین ہی کی ایک جماعت ہوئی ہے، جس کے نزدیک نظم و انضباط کا نام خُشکی تھا۔ حالانکہ حضور انورؐ بڑے ہی لطیف المزاج ہوئے ہیں۔ اور قرآن مجید نے آپ کے "غلیظ القلب" ہونے کی نفی کامل فرمائی ہے — بے شک مزاج میں حرارت و حدت تھی (جس طرح آپ کو نسبی نسبت فاروق اعظم سے تھی)، لیکن آپ اس کا استعمال موقع اصلاح پر تادیب

ہی کے لیے کرتے تھے۔ یں نے آپ کو صحت و مرض قوت وضعف، حزن و نشاط کے ہر موقع پر دیکھا ہے۔ اس لیے آنکھوں دیکھی شہادت دے رہا ہوں۔ نظم و انتظام کے تو آپ بادشاہ ہی تھے افراط و تفریط اکثر بزرگوں اور اولیائے اُمّت یں ہوا کرتی ہے۔ کوئی کسی خصلت یں بہت زیادہ بڑھا ہوا اور کوئی کسی خصلت یں۔ توازن و اعتدال حضرات انبیا کا خاصّہ ہوتا ہے۔ اسی سیرت انبیائی کی جھلک آپ یں دیکھنے یں آئی۔ ہر کام اپنے وقت پر، ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر۔ کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، اُٹھنے بیٹھنے، سب کے ضابطے، سب کے آداب، ہر گفتگو ایک مقصد لیے ہوئے، بے مقصد گفتگو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ زبان پر اتنا قابو یں نے کسی بزرگ کا نہ پایا۔ اور اوراد و وظائف پر جو زور دوسرے آستانوں پر رہتا ہے اُس کا یہاں نام ہی نہ تھا۔ رسوم سے اجتناب، نمائشی تکلفات سے احتراز، بس اپنے کام سے کام، دوسروں کو زحمت سے بچانے کا کامل اہتمام، بندوں کی خدمت عبادت کے درجے یں۔ بس یہی خصوصیات مجلس اشرفی کے دیکھنے یں آئے۔

اب بہت بڑی بات کہنے جا رہا ہوں، وہ بہ ظاہر ایک بہت چھوٹے منہ سے نکل رہی ہے، لیکن بات کو دیکھیے، کہنے والے کو نہ دیکھیے۔ حکیم الامت سے اللہ نے سلوک و طریقت کی وہ خدمت لی ہے جو آج تک بڑے سے بڑے صوفیہ اور مشاہیر اولیا سے بن نہیں پڑی تھی۔ یعنی افعال انسانی کی بنیادی تقسیم اختیاری اور غیر اختیاری کے درمیان۔ اور اسی تقسیم کے بعد، کوئی بھی فعل بہ ظاہر کتنا ہی گندہ اور قبیح ہو، اگر پورے اختیار سے سرزد نہیں ہوا، تو اس کا شمار فسق و معصیت یں سرے سے ہو ہی گا نہیں، معصیت کی سنگینی کا معیار تو صرف بشری ارادہ و اختیار ہے، تو اب بدتر سے بدتر عمل بھی اگر ہر رات اور ساری عمر، عالم رویا یں کرتا رہے تو اس سے معصیت ایک بار بھی نہیں لکھی جائے گی اس لیے کہ عمل ہزار بار کا بھی کیا ہوا شعور و ارادے کے ماتحت واقع نہیں ہوا۔ آنکھ اگر نماز کے وقت نہ کھُلی تو تدارک کے لئے بس نماز کا قضا پڑھ لینا کافی ہے۔ یہ کوئی گناہ ہوا ہی نہیں۔ اس لیے کہ عمل ارادی تھا ہی نہیں،

جس کا کفارہ لازم آئے ـــــ ایک اسی بنیادی مسئلے نے لاتعداد جزئی مسائل طے کر دیے اور بے شمار الجھنوں سے بچا لیا۔ بجا ہے کہ اگر کوئی اسی حقیقت کی بنا پر حضرتؒ کو اشرف الاولیاء قرار دے دے۔

چونکہ اوقات بڑے مرتب ہوتے تھے، وقت کے لمحات ضائع نہیں ہونے پاتے تھے۔ اللہ نے وقت میں برکت بھی بڑی عطا فرمائی تھی۔ جوانی بھر تدریس کا کام کرتے رہے، اس کے باوجود بھی تصانیف و مواعظ کی تعداد دہائیوں سے گزر کر پچاسوں تک پہنچ گئی اور چھوٹے بڑے تقریباً ہر موضوع پر آپ کچھ لکھ ضرور گئے ہیں۔ کتابچوں اور مقالوں سے بڑے بڑے ضخیم مجلدات تک، یہی حال کیفیت و کمیت کے لحاظ سے وعظوں کا بھی ہے۔ وعظ آپ کے سیکڑوں کی تعداد میں ضرور ہوں گے اور ان میں بیشتر طبع ہو چکے ہیں۔ فرق تصانیف اور مواعظ میں صرف یہ ہے کہ کتابیں جو ہیں وہ عموماً اہل علم ہی کے لئے لکھی گئی ہیں اس لیے اصلاً طلبۂ فن کے لئے ہیں اور عام فہم نہیں رہی ہیں، بہشتی زیور قسم کی کتابیں اس سے مستثنیٰ اور عام فہم ہیں۔ برخلاف اس کے وعظوں میں ان کے مخاطب عوام و خواص، ہر سطح و استعداد کے لوگ ہوتے تھے، اس لیے ان کا بیشتر حصہ عام فہم و سلیس ہے ـــــ نافع اپنی اپنی جگہ تصانیف و مواعظ دونوں۔ اور تعداد اگر غیر مطبوعہ نسخوں کی بھی ملا لی جائے، تو کتابوں اور وعظوں کا مجموعہ سیکڑوں سے گزر کر ایک ہزار کے لگ بھگ تو ضرور پہنچ جائے۔ حکمت اور توازن کا ہنر و سلیقہ مندی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے جزیہ میں نمایاں ہوتی۔

حضرت بطور میزبان بھی ایک مثالی قسم کے انسان تھے، یہ نہیں کہ اندھا دھند بس رسمی خاطر داری ہی کرتے چلیں اور مہمان کی اصل راحت، سہولت، ذوق، طبع اور معمولات کا لحاظ کیے بغیر، بس اپنی طرف سے اندھا دھند کرتے چلے جائیں۔ ایک بار کیا ہوا کہ میں سہارن پور سے کوئی قریب ۹ بجے صبح کے چل کر ۱۱ بجے پہنچا۔ حضرت کے ہاں کھانے کا وقت بھی تھا۔ فرمایا "کھانا کھاؤ گے؟" میں نے عرض کی کہ "کھا کے تو چلا تھا"، سکوت فرمایا، اور مجھ سے اصرار نہ کیا۔ میں نے "کھانا" تو اصطلاحی

معنی میں کھایا نہ تھا، ناشتہ البتہ خوب ڈٹ کر کر لیا تھا جو کھانے ہی کا کام دے۔ گرمی کا موسم تھا غالباً جون کا مہینہ تھا، اُس وقت بھوک واقعی بالکل نہ تھی، کچھ دیر بعد خواہش ذرا معلوم ہونے لگی کوئی ایک کے قریب وقت تھا کہ بھوک خاصی تیز ہو گئی۔ مہمان خانے میں تنہا لیٹا ہوا تھا، کہ عین اُس وقت مولانا کے خادم خاص میاں سلیمان (حضرت کے دو خادم خاص تھے، ایک ایک زنانی ڈیوڑھی پر رہتے تھے) ایک بڑی پلیٹ میں دو بڑے قلمی آم اور کئی تخمی مع چاقو و خوان پوش کے پہنچے اور یہ پیام دیا کہ "بعض دفعہ بھوک اُس وقت نہیں ہوتی لیکن کچھ وقت کے بعد پیدا ہو جاتی ہے مجھ سے فرمایا ہے کہ سامان جا کر اُن کے پاس رکھ دینا۔ اور رکھ کر چلے آنا۔ جی چاہے گا تو بے تکلف کھا لیں گے۔ کسی کے سامنے بے تکلفی نہیں ہوتی ہے" حکیم الامت کی یہ تشخیص اپنے ہر ہر جزئیہ کے لحاظ سے حکیمانہ تھی، بھوک واقعی اتنی دیر میں لگ آئی تھی۔ اور کسی اور کی موجودگی بھی ایک حد تک مُخل ہو رہی تھی —— یہ ایک ہلکا سا نمونہ پیش کر دیا گیا۔ دن رات نہ معلوم کتنی ایسی ہی چیزیں پیش آتی رہتی تھیں۔ ہر چیز حضرت کی حکمت اور دقیقہ رسی کی مُظہر ہی ہوتی۔

سیاسی مسائل میں حضرت کا مسلک بزرگانِ دیوبند کی اکثریت سے الگ، انگریزی حکومت سے مصالحت و مفاہمت، اور ایک قسم کی موالات ہی کا تھا (اور یاد کر لیجیے، کہ حضرت کی وفات انگریزوں ہی کے دور میں ہوئی تھی" آزادی سے کوئی ۴، ۴½ سال قبل) حضرت ہر مسئلے کی تائید میں شرعی دلائل رکھتے تھے۔ اور دیوبند والوں کا پورا احترام بھی کرتے تھے، اخبارات نہ زیادہ پڑھتے تھے نہ اس کی فرصت ہی رکھتے اور نہ سیاسی حالات سے نہ ہندوستان ہی کے زیادہ باخبر تھے اور نہ بیرونی ملکوں کے۔ بس ایک آدھ ہفتہ وار پرچہ کوئی بھیج دیتا تھا اور اس کے پڑھنے پر قانع رہتے اور ایسی دینی تحریکوں کی پُرزور تائید کرتے رہتے، جن سے اُمت کی کچھ بھی فلاح و بہبود کی امید تھی، مسلمانوں کی دینی "ریفارم" یا "اصلاح" کی تو نہیں، دنیوی خیر و فلاح کے بڑی دردمندی کے ساتھ بڑے قائل تھے۔

اولاد دونوں محلوں سے کوئی نہ تھی۔ ایک چھوٹے بھائی شیخ اکبر علی مرحوم مینجر کورٹ آف وارڈس کے تھے ان کے لڑکے مولوی شبیر علی کو مثل اولاد ہی کے چاہتے تھے، اور وہی کتابوں کی اشاعت کے اور خانقاہ وغیرہ کے مینجر بھی تھے۔ حضرت کے والد ماجد نے جائداد خاصی چھوڑی تھی ترکے میں سے کچھ نہ لیا، ساری جائداد بھائیوں ہی کی طرف منتقل کر دی۔ اور گویا جائدادی جھگڑوں کی جڑ ہی کاٹ دی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر معاملے میں رویہ صلح و آشتی ہی کا رکھتے تھے اور اس میں پیش قدمی بھی خود ہی کرتے رہتے۔ مخالفت ذاتی، خانگی معاملات میں گویا کسی سے تھی ہی نہیں۔

سیاسی و مذہبی اختلافات میں لوگ علی العموم حد سے آگے نکل نکل گئے اور سب و شتم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن حضرت نے اپنے قلم سے جوابی تکفیر بھی نہ کی۔ کتابیں ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی تعداد میں بکیں، کوئی دوسرا ہوتا تو لکھ پتی ہو جاتا۔ یہاں کاپی رائٹ تک قبول نہ کیا۔ کسی زمانے میں بعض کمپنیوں میں حصہ لیا تھا۔ بس اُس پر آخر تک گزارا رہا۔

معتقدوں میں اچھے خاصے رئیس و اہل ثروت موجود تھے، لیکن نذرانہ بس خصوصی مخلصوں ہی سے قبول فرماتے اور ان کے لیے بھی حدود مقرر تھے۔ موروثی مکان کے علاوہ ایک مکان اپنے ذاتی پیسے سے بنوایا۔ وہ مکان تعمیری حیثیت سے بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ یعنی مختصر ہونے کے باوجود مکان اتنی سہولتوں اور بشری ضرورتوں کا جامع اور اتنا آرام دہ کوئی دوسرا مکان اس سے دگنا تگنا رقبہ رکھنے والا بھی مشکل ہی سے ہم پلّہ ہو سکتا ہے لیٹنے بیٹھنے، نہانے، دھونے، کھانا پکانے اور کھانے، خلوت و جلوت سب ہی کی رعایتیں ہر موسم کی مناسبت سے اس میں موجود۔ کیا کسی انجینیر کا دماغ ان باریکیوں تک پہنچ سکتا! توازن و حکمت حضرتؒ کے ریشے ریشے میں بسی ہوئی تھی، زندگی کے ہر شعبے اور صنف میں نمایاں تھی۔

علومِ دینِ ظاہری میں جو پایہ تھا خصوصاً تفسیر میں، اس کی نظیر بھی ہر دور میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ تفسیر اس قابل ہے کہ اس کی بھی شرحیں اور حاشیے لکھے جاتے۔ اور کم سے کم اس کے وقت اشاعت تک تو بے نظیر ہی سمجھا جاتا تفسیر تو خیر تفسیر ہے، ترجمۂ قرآن تک زبان و

سلاست کے پہلو سے بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

جہاں تک علوم باطنی کا تعلق ہے یعنی اسلامی سلوک (معرفت و روحانیات تصوف سے الگ) اصلاح نفس کا تعلق ہے، ان شاء اللہ اس دعوے کی لاج اللہ رکھ لے گا، کہ تاریخ اُمت میں کوئی ہستی، مرشد، مربی و مصلح ان سے برتر نظر نہیں آتی۔ غزالی کا مرتبہ بے شک بہت بلند ہے، بلکہ یہ کہنے دیجیے کہ امام تھانوی کے زمانے سے قبل انھیں کا مرتبہ بلند ترین ہے، لیکن تربیت السالک وغیرہ میں جیسی جیسی گتھیاں سلجھ کر آ گئی ہیں، ان کے بعد امام تھانوی کا پلہ کچھ بھاری ہی نظر آئے گا۔ "حکیم الامت" جس کسی نے ان کا لقب اول بار رکھا وہ بجائے خود بھی ایک حکیم اور عارف اور ترجمانِ حقیقت تھا!

احمد شریف شیخ سنوسی

(متوفی ۱۹۳۳ء)

نوجوانی میں شیخ سنوسیؒ کا نام اخباروں میں اکثر نظر سے گزرتا رہتا تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ یہ کوئی بڑے شیخ طریقت ہیں، اُن کے ہزارہا مُریدہیں، خود شیخ طرابلس میں رہتے ہیں، جس کی سرحدیں حکومت اٹلی سے مُلحق ہیں، اور شیخ فرنگیوں سے جہاد وقتال میں معروف رہا کرتے ہیں۔ خیال بھی نہ گزرتا کہ شیخ کی زیارت بھی کبھی ہوسکے گی۔

۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے جانا ہوا، اور غالباً شروع مئی کا زمانہ تھا جب مکہ معظمہ پہنچنا ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہاں خانہ کعبہ سے بڑھ کر اور کون شے قابل زیارت ہوسکتی تھی، اور اس کے سامنے کوئی اور چیز قابل زیارت ہوتی بھی تو کیونکر۔ تاہم معیاری بزرگ جو اپنے علم میں آسکے، ان کی زیارت بھی ضروریات میں سے تھی اور اس مختصر فہرست میں نمبر اول پر نام خلیفہ شیخ سنوسیؒ کا تھا۔ حیرت اور بڑی ہی مسرّت کے ساتھ اس خبر کو سُنا کہ شیخ کا قیام ان دنوں یہیں ہے۔ دل کے شوق وعقیدت نے فوراً ان کے لیے صدائے لبیک بلند کرنا شروع کردی۔

ملاقات کی گھڑی آگئی۔ فرش پر تکیے سے متصل ایک پیکر نور جلوہ گر تھا، رنگ سُرخ وسفید، گول چہرہ، نورانی داڑھی، عمر کوئی ۶۹، ۷۰ کی نظر آئی۔ میں نے بزرگ اور بھی دیکھے ہیں، کسی اور سے قلب اتنا متاثر ومرعوب نہیں ہوا (استثنا اگر کیا جاسکتا ہے، تو حضرت تھانویؒ کی پہلی زیارت کے اثر کا)، اللہ اللہ! ایک سچّے مجاہد کی شبیہ نظر آرہی تھی، ایک صحابی رسولؐ کا نمونہ۔ زبان کیا کھلتی، جسم میں ایک کپکپی سی تھی۔ سچ کہا ہے عارف رومی نے ؎

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست ٭ ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

ترجمہ:۔ یہ ہیبت حق کی ہے کسی بشر کی نہیں، یہ ہیبت اس گدڑی پوش بشر کی تھوڑے ہی ہے!

میں عربی میں گفتگو پر یوں بھی قادر نہیں ہوں، تو اس درجہ پُر رعب شخصیت سے تخاطب کیا کرتا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ہر ایسے موقع کی طرح یہاں بھی کام آئے۔ ہم سب کی طرف سے ترجمانی شروع کر دی۔ کتنی دیر حاضری رہی یہ تو اب کہاں یاد، بہرحال خاصی دیر تک رہی اور جتنی دیر بھی رہی، میں عقیدت میں غرق صرف چہرۂ انور ہی دیکھتا رہا۔

دل کو تسلی ہو گئی کہ ایک نمونہ جلوۂ صحابیت کا دیکھ لیا! اللہ ان کا مرتبہ تو بڑا سا بڑا بلند ہی کرے، اور ان کے سائے میں ان کی زیارت کرنے والوں کو بھی سمیٹ لے۔

شاہ محمد یعقوبؒ مجدّدی

(متوفی ۔ ۱۹۷۰ء)

بعد حضرت تھانویؒ کے پھر اگر کسی کی درویشی اپنے دل میں بیٹھی ہے تو وہ بھوپال کے شیخ طریقت شاہ محمد یعقوب مجددی نقش بندی تھے ۔ اتنے انکسار و تواضع کے ساتھ ایسی بابرکت صحبت اور حکمت معرفت سے لبریز ایسی گفتگوئیں کہیں اور نہ دیکھنے میں آئیں اور نہ سننے میں۔ حاضری کا موقع شاید کل دو ہی تین بار ہوا ۔ اور اس میں بھی ایک موقع پر حضرت خود سخت بیمار تھے ۔ لیکن ان چند گھنٹوں کے اندر طبیعت کو وہ کیف وہ لطف آگیا، جس کے لئے دوسروں کے آستانے پر مدتوں امیدواری کرنا پڑتی ۔ اور اس سرزمین تک پہنچنے کے لئے دل شکرگزار اور احسان مند اپنے قدیم رفیق و عزیز علی میاں ندوی، اور پھر مولانا عمران خاں ندوی بھوپالی کا کاہے ۔ علی میاں نے وہاں کی راہ دکھائی اور ملاقات وحصول فیض کے عملی موقع خاں صاحب نے پیدا کر دیے ۔

حشر میں اگر یہ سوال ہوا کہ بتاؤ ہمارے دوستوں میں سے کس کس کو پایا اور کس کس سے کسب سعادت کی ؟ تو یہ نامہ سیاہ جو دو چار نام قطعیت سے عرض کرے گا اس میں ایک نام ان شاء اللہ ان بھوپالی بزرگ کا ضرور ہوگا ۔ حضرت تھانوی کے بعد میں تو مایوس ہو گیا تھا کہ اب کون بزرگ اس روحانی قدو قامت کا نصیب ہوگا ۔ لیکن اپنی خوش نصیبی میں شک نہیں کہ ان بھوپالی بزرگ تک رسائی ہو گئی اور وہی لذت ایک بار پھر مل گئی، جو کبھی حضرت تھانوی کی مجلسوں میں ملا کرتی تھی ۔ اللہ ان کے مرتبے بلند سے بلند کرے اور انھیں کے طفیل میں ہم ہیچ مدانوں کو بھی سمیٹ لے !

اکبر الٰہ آبادی

(متوفی۔ ۱۹۲۱ء)

اکبر کا کلام اس کم سنی میں سنا کہ اب وہ زمانہ بھی یاد نہ رہا۔ کوئی ۸، ۹ سال کا سن ہوگا۔ ان کے دل لگی کے شعر ایک ایک کی زبان پر تھے، خیال یہی تھا کہ شاعر صاحب بڑے ہنسنے ہنسانے والے ہوں گے، اور ہر وقت ہنستے رہتے ہوں گے۔ ۲۰ سال کے سن میں ۱۹۱۲ء میں جب ملاقات ہوئی تو یہ خیال بے بنیاد پایا۔ ہنساتے تو بے شک تھے، لیکن خود بہت کم ہنستے، اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنستے تو شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ آخر میں ہنسی میں اتنی کمی شاید استحضار آخرت کا نتیجہ ہو۔ قائل توحید کے بھی سخت قسم کے ہوگئے تھے۔

۱۹۱۰ء میں ان کے صاحب زادے سید عشرت حسین بی۔ اے (کیمبرج) ڈپٹی کلکٹر ہوکر سیتاپور آئے۔ اور ہمارے ہی گھر میں اُترے، یہ کوٹھی راجہ صاحب محمود آباد کی تھی، اور دو ایک کمرے خاص راجہ صاحب کے لئے خالی رہتے تھے۔ اُنھیں خالی کمروں سے کام لیا۔ میں اس وقت لکھنؤ میں کالج میں پڑھ رہا تھا، اور کلیات اکبر حصہ اول اس وقت پڑھ چکا تھا۔ میرے والد ماجد خود بہ شمنر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان نئے ڈپٹی کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اکبر زادہ کی حیثیت سے ان کی اور زیادہ خاطر مدارات کی۔ عشرت صاحب معاشری حیثیت سے بالکل صاحب بہادر تھے۔ یہاں تک اردو بھی ذرا اٹک اٹک کر بولتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے انگریزی سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ والد صاحب نے ان کی اسلامی معاشرت کی طرف بھی دھیان رکھا۔ چناں چہ جب عید کا دن آیا تو ان کا سوٹ اُتروا کر، اور شیروانی پہنا کر اپنے ساتھ عیدگاہ لے گئے۔ اکبر صاحب ان باتوں سے بہت ہی خوش ہوتے، اُنھیں تو جیسے منھ مانگی مُراد مل گئی تھی۔ اسلامی تربیت و معاشرت کو اپنے برخوردار کے حق میں ترسے

ہوئے تھے۔

یہ عین وہ زمانہ تھا، جب میرے الحاد و تشکیک کا شباب تھا۔ میں چھٹیوں میں جب سیتاپور آتا تھا، تو ان ڈپٹی صاحب سے خوب مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ یہ ڈپٹی صاحب تازہ ولایت، دہریت و لاادریت کے رنگ ڈھنگ سے خوب واقف تھے، خیالات میں اپنے والد گرامی کی حرارت ایمانی سے کوئی نسبت نہ رکھتے۔ لیکن آخر تھے تو انھیں کی اولاد ع۔

مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

کبھی کبھی میری فرنگیانی لن ترانیوں پر خوب چوٹ کر جاتے اور میرا منھ بند کر کے رہتے! میں امریکہ کے مشہور عالم نفسیات ولیم جیمس کا بہت زیادہ قائل تھا۔ اُس کی وفات کی خبر آئی۔ میں نے عشرت صاحب سے کہا (گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی) کہ " وقت کا سب سے بڑا شخص (The greatest man of his age) اُٹھ گیا، اس پر وہ ہنسے اور بولے کہ " وقت کا سب سے بڑا شخص اگر یہ تھا، تو پھر مل (Mill) کے لیے آپ کیا کہیں گے؟ (اس ملحد فاسق کے میں شیدائیوں میں تھا) میں نے تڑک کر جواب دیا کہ " وہ تو اپنے وقت کا نہیں، ساری دنیا اور کلُ زمانوں کا سب سے بڑا شخص (The greatest man of all times) تھا! اس پر وہ خوب ہی ہنسے اور بولے کہ " اچھا اپنا یہی فقرہ آپ کاغذ پر مل کے متعلق لکھ کر آج کی تاریخ ڈال دیجیے، میں دس سال بعد آپ کو دکھلا کر پوچھوں گا کہ کہیے اب وہ جوشِ عقیدت کہاں گیا؟ "

اس وقت تو میں نے جوشِ جاہلیت جاری رکھا اور شاید یہی کہا کہ " دس برس نہیں بیس برس میں دکھائیے تو یہی قول اٹل رہے گا " حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ عشرت صاحب دس برس نہیں، پانچ ہی برس بعد مجھ سے مواخذہ و محاسبہ کرتے تو میں بغلیں جھانکتا رہ جاتا۔

لیجئے، یہ اکبر صاحب کے ذکر میں ان کے فرزند دلبند کا اتنا تذکرہ کہاں سے نکل پڑا۔ مارچ یا اپریل سنہ ۱۹۱۲ء تھا، جب میں بی۔اے کا امتحان دینے الہ آباد گیا (لکھنؤ یونیورسٹی اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی) بی۔اے کے لکھنوی طلبہ کو امتحان دینے الہ آباد جانا ہوتا تھا۔ گیا اور

وقت نکال کر حضرت اکبر کی خدمت میں ایک سے زائد بار حاضری دی۔ سراپا کرم و شفقت نکلے۔ بڑے ہی خُلق و لطف سے ملے۔ میں سن میں اُن کے صاحب زادے سے بھی ۸، ۱۰ سال چھوٹا تھا، لیکن وہ پیش آئے، کہ جیسے میں کوئی ان کے برابر کا ہوں۔ اپنا کلام سُنایا، میرے مذہبی خیالات سے بھی کچھ واقف ہو چکے تھے۔ کچھ بند بند اشارے ادھر بھی کیے۔ الہ آباد سے لوٹ کر لکھنؤ آیا تو اب راستہ کھل گیا تھا، مُراسلت شروع کی، اور اچھی خاصی مُستعدی سے اور پابندی سے جاری رکھی۔ جواب جلد جلد آتے اور مفصل بھی ہوتے۔ اکبر کا جو پایہ شعر میں ہے، ظاہر ہی ہے۔ نثر بھی بڑی اچھی لکھتے تھے، سادہ و سلیس، شگفتہ۔ اور صحیح تو خیر ہوتی ہی تھی۔ مجھے تو نثر میں ریاض کے ہم رنگ و ہم سطح نظر آئے۔

والد مرحوم کا انتقال نومبر ۱۹۱۲ئ میں مکہ معظمہ میں وسط ذی الحجہ میں ہوا، عین ارکان حج سے فراغت کے بعد۔ حضرت اکبر نے میری گزارش پر قطعۂ تاریخ لکھا۔ کمال یہ کیا کہ صرف ایک لفظ شغل (بہ اصطلاح صوفیہ) سے پوری تاریخ نکال دی ؎

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے
شغل ہی سے نکلی تاریخ وفات
۱۳۳۰ھ

خط بڑے دلچسپ ہوتے تھے، ادبی بحثیں تو قدرتاً ہوتیں، دینی، اخلاقی، سیاسی نصیحتیں بھی کر جاتے تھے، اور زبانی ملاقاتوں میں تو اصلاحی عنصر ہر چیز پر غالب رہتا۔

بحث و مناظرہ کی طرف کبھی نہ آتے، نرم، شیریں، بلیغ، موثر انداز سے ہمیشہ کام کی بات کہہ جاتے۔ یہ خوب خیال رہے کہ ۱۹۱۲ئ میں اور اس کے کئی سال بعد تک زمانہ میرے الحاد و بے دینی کا رہا۔ جراثیم اس کے ۱۹۰۹ئ ہی سے پیدا ہو چکے تھے۔ مغربی فلسفیوں اور مادہ پرست فرنگیوں نے اپنی تاریخی بلکہ طبی کتابوں تک سے اسلام کو داغ داغ کر کے رکھا تھا۔ اور میں مغرب کا پرستار اُس وقت بے تحاشا اُن کا شکار بن گیا تھا۔ اور فرنگی "تحقیقات" کا زہر اپنے

اندر اندر پلتا رہا۔ قدرتاً ذاتِ رسالتؐ سے (نعوذ باللہ) ایک بغض و عناد سا ہو گیا۔ وحی و نبوت ایک وہم آرائی ہی نظر آنے لگی، ایک رکیک کتاب بھی اُسی زمانے میں اپنے ہی بدبخت قلم سے ایسی نکلی، جس میں اپنی "تحقیق" کا ہدف انبیائے کرام علیہم السلام کو بنایا تھا، کتاب اکبر صاحب کی خدمت میں بھی ہدیۃً بھیجی۔ کتاب کے اخیر میں مضمون کچھ اس قسم کا تھا کہ اپنی دھاک اور اپنا رعب دلوں میں قائم رکھنے کی یہ تدبیریں اختیار کی جائیں، یا کچھ اور، بہر حال قضا و موت سے کسی کو بھی چارہ نہیں۔ کسی نہ کسی دن بڑے سے بڑے لیڈر کا بھی اقبال غروب ہی ہو کر رہتا ہے۔ اکبر صاحب نے فرمایا، جب کچھ ہی روز بعد میں الہ آباد میں جا کر ملا "کتاب آپ نے مجھے بھی بھیجی، فلسفہ پڑھنے کے لیے دماغ کہاں سے لاؤں، ہاں اخیر کے اس مضمون پر نظر پڑ گئی جہاں آپ نے بالآخر ہر حکمت و تدبیر کے لیے فنا لکھی ہے، بس دل اسی سے باغ باغ ہو گیا، یہ تو کچھ ایسا ہی ہوا کہ ایک بیسوا محفل میں گا بجا رہی ہو، سارا مجمع اس کی اداؤں پہ فدا ہو رہا ہو، اک بارگی وہ گرے اور اپنی جان دے دے۔ وہی محفل جواب تک لذت پرستی اور واہ واہ میں مست تھی یک بہ یک بزمِ عزا و ماتم میں تبدیل ہو جائے گی۔ میرے اوپر تو کتاب کا کچھ ایسا ہی اثر پڑا۔

کبھی کبھار لکھنؤ تشریف لاتے، ایک مرتبہ تو میرے ہی ہاں قیام فرمایا۔ گھر خالی تھا۔ زنانہ اُس وقت نہ تھا۔ کئی دن تک لکھنؤ کے شاعروں کا خوب جمگھٹا رہا۔ خوب خوب حضرات ملنے آتے رہے۔ اور یہ تو ایک بار ہوا، باقی کبھی امین آباد میں اپنے کسی الہ آبادی تاجر دوست کے ہاں ٹھہرتے، کبھی قیصر باغ میں سلیم پور ہاؤس میں افتخار حسین کاکوروی کے ہاں اور کبھی خود مجھے الہ آباد بلا بھیجتے اور کرایہ منی آرڈر سے پیشگی بھیج دیتے۔ ایک بار پرتاب گڑھ بلا بھیجا۔ کہ ڈپٹی عشرت حسین اس وقت وہیں تھے۔ جب اس طرح میں مہمان بنتا، خوب خوب باتیں کرتے، اب میں کیا کہوں کہ کتنا مستفید ہوا، ادبی بحثوں اور ان سے بھی بڑھ کر دینی و روحانی حکیمانہ کلمات سے۔ ایک بار فرمایا کہ "آپ نے کالج میں زبان کون سی لی تھی؟" عرض کیا کہ "عربی"۔

بہت خوش یہ سن کر ہوئے اور بولے کہ "اب بھی عربی کا مطالعہ جاری ہے؟ عربی تو دنیا کی زبردست زبانوں میں ہے۔ یورپ والے بھی اس کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔" میں نے مرے ہوئے لہجے میں عرض کیا کہ "اب کہاں موقع ملتا ہے۔ انگریزی ہی سے چھٹی نہیں ملتی۔" بولے کہ "آسان ترین صورت یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کا معمول رکھیے، اس کی زبان کی فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا جرمن یونی ورسٹی میں عربی کے نصاب میں آخر کا آدھا قرآن شامل ہے، اور یہاں آپ کے لئے نہ وضو کی قید ہے، نہ کسی وقت و مقدار کی، بس جتنا جی چاہے پڑھ لیا کیجیے۔ بس اس سے عربی زبان سے رابطہ آپ کا بالکل قائم رہے گا۔ جو فقرے آپ کو پسند نہ آئیں، اُن سے سرسری گزرتے جائیے، سمجھیے کہ وہ آپ کے لئے ہیں ہی نہیں۔ ہاں کبھی کوئی فقرہ پسند بھی آجائے گا۔ بس اسی کو ذرا توجہ سے دو تین مرتبہ پڑھ لیا کیجیے۔" کس حکمت کے ساتھ آپ نے دیکھا کہ ایک ملحد کو قرآن کی طرف لائے!

ایک مرتبہ بولے کہ "کیوں صاحب آپ کو اللہ میاں سے متعلق جو کچھ شک و شبہے رہے ہوں، یہ فرمائیے کہ کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟" سوال سنتے ہی میں چکرا گیا اور دب دبا کر بولا کہ "جی نہیں، اس میں تو کبھی شبہ ہوا ہی نہیں، اور شاید ہو سکتا بھی نہیں ہے۔" بولے کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اپنی عبدیت کا اقرار کیے جائیے۔ رہی اللہ کی ذات و صفات تو وہ آج تک کس کی سمجھ میں آئی ہیں؟ جنھیں بڑے سے بڑا عالم و عارف کہا جاتا ہے، وہ بے چارے انھیں بحثوں میں حیران و ششدر نظر آتے ہیں، جبھی تو میں نے کہا ہے ع

"بندگی حالت سے ظاہر ہے، خدا ہو یا نہ ہو۔"

میں قائل تو معاً کیا ہوتا۔ البتہ سوچ میں اسی وقت سے پڑ گیا، اور دماغ کو ایک نیا موضوع سوچنے کا مل گیا۔

ایک بار جب میں از سرِ نو مسلمان ہو چکا تھا اور اکبر صاحب کا مہمان بن کر انھیں کے دولت خانے میں ان کے ساتھ نماز ظہر میں پہلی بار شریک ہوا تو بہت خوش ہوئے، دعائیں

دیں، اور بولے کہ "آپ کے والد مرحوم کو فرشتوں سے آپ کی نماز کی خبر سن کر کس درجہ مسرت ہوئی ہوگی"!

ایک بار کچھ عرصے بعد اس زمانے میں جب میرے اوپر مثنوی رومی کا اثر غیر معمولی تھا اور گویا قرآن مجید سے بھی بڑھ کر مثنوی کو سمجھ رہا تھا، اور بار بار اپنی گفتگو میں حوالہ حضرت رومیؒ کا دیتا تھا، اکتا کر حضرت اکبر بولے کہ "اچھا صاحب، یہ بتائیے کہ اللہ میاں بڑے ہیں، یا مولانا رومی؟ ظاہر ہے کہ لاجواب ہو جانے کے سوا میں اس کا جواب ہی کیا دے سکتا تھا۔ اس پر بولے کہ "آپ کی زبان سے بجائے اللہ کے ذکر کے نام مولوی رومی کا سنتا رہتا ہوں، میں سمجھا کہ شاید وہ اللہ میاں سے بھی بڑے ہوں۔ آپ یہی سمجھ رہے ہیں کہ مولانا نے آپ کو ہدایت دی اور اللہ تک وہ آپ کو لے آئے۔ سوچ کا یہ طریقہ بدلیے، یہ سمجھیے کہ اللہ نے مولانا کو ذریعہ آپ کی ہدایت کا بنایا"۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ "لوگ یہ جو کہتے ہیں کہ وقت چلا گیا، زمانہ گیا، تو یہ وقت، اور زمانہ آخر کہاں چلا جاتا ہے؟" پھر وہ ایک لمحہ ٹھہر کر خود ہی فرمایا کہ "آسان جواب بتلائے دیتا ہوں، اللہ میاں کے پاس سے آیا تھا اور انھیں کے پاس چلا جاتا ہے، اور وہاں جا کر کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی، ہر چیز محفوظ اور جمع رہتی ہے۔ پھر جب وقت وہاں جمع ہے تو جو کچھ بھی اس وقت کے اندر ہوا ہے، وہ بھی لامحالہ جمع ہوگا۔ اب اللہ جب اس وقت کو زندہ اور حاضر ہونے کا حکم دے گا تو جو کچھ بھی اس وقت کے اندر ہوا ہے سب ہی کچھ اس کے ساتھ حاضر ہو جائے گا اور انسان کو اپنا ہر عمل، رجسٹر پر لکھا ہوا نہیں، بلکہ بجنسہ اپنی اصلی حالت و ہیئت کے ساتھ برتا ہوا مل جائے گا۔"

اسی طرح واللہ اعلم کتنے مسئلے تصوف و فلسفہ کے انھیں لطیفوں، چٹکلوں کی صورت میں بیان کر جاتے تھے، اور کوئی صحبت اس سے خالی نہیں ہوتی۔ عجیب جامع کمالات ذات تھی!

توحید کا اتنا غلبہ میری نظر نے تو بہت ہی کم کسی پر دیکھا ہے، کوئی بات کہیں سے بھی شروع ہوتی، جھٹ وہ اس کا سرا لا کر اللہ میاں سے لگا دیتے۔ بزرگوں اور اولیاء اللہ کا ذکر

زیادہ دیر تک نہیں سن سکتے فوراً توحید پر لے آتے۔ حد یہ ہے کہ نعتیہ مضمون یا شاعری کو بھی دیر تک چلنے نہ دیتے، بلکہ کوئی نہ کوئی فقرہ اس طرح کا ضرور بول دیتے کہ "جی ہاں ہمارے اللہ میاں کا کیا کہنا، دیکھیے کس قیامت کا جامع بشر پیدا کر دیا!"

ایک دن بولے کہ "جن شاعروں نے محض شاعری اور ادبیت اور زبان کی بنا پر کمال حاصل کرنا چاہا انھیں قبول عام حاصل نہیں ہوا اور فن کی شہرت بھی ادبی، علمی حلقوں تک محدود رہی، مثلاً شاہ نامہ اور سکندر نامہ لکھنے والے، لیکن جنھوں نے اپنے کو مٹا کر اللہ کا نام بلند کیا، اللہ نے ان کی یاد کو بھی محفوظ کر دیا اور ان کا نام گھر گھر پہنچا دیا۔ جیسے مولانا ے روم، سعدی یا امیر خسرو وغیرہ۔"

مغربی تہذیب و تمدن کے لائے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے، مگر یہ اُن کے یا کسی کے بس میں کہاں تھا۔ اور مشرقی تہذیب اور اسلامی ثقافت کی تبلیغ بڑے دل چسپ، مُوثر و دل نشیں انداز سے کرتے رہتے۔ علماے عصر میں حضرت تھانویؒ کے دل سے قائل تھے اور ایک حد تک دوسرے دیوبندی حضرات کے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے علمی کمالات کے قائل تھے، مگر اس سے آگے نہ بڑھتے۔ فرما گئے ہیں ؎

ہے دل عارف مثال دیوبند

اور ندوہ ہے زبان ہوش مند

خود گاندھی جی کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے۔ میں خود البتہ اس زمانے میں بڑا "گاندھوی" تھا اور ان کی روحانیت کا چرچا ہر جگہ کرتا رہتا تھا۔ ایک صاحب کے سامنے بھی کیا۔ ان صاحب نے کچھ دیر بعد سوال کر دیا: "ہاں صاحب، آپ کے مہاتما جی کی کمیٹی ترک موالات میں شرکت کی پہلی شرط تو توحید کے قائل ہونے لا الٰہ الا اللہ کے پڑھنے کی ہوگی،" اور جواب مجھ سے نفی میں پا کر بولے کہ "میں آپ کی روحانی داد و تحسین سے یہی سمجھا تھا کہ پہلی شرط توحید کی ہوگی!"

انتہا یہ کہ اقبال کے بھی سو فیصدی مداح نہ تھے، جا بجا لطیف چوٹ کر جاتے، مثلاً ؎

کالج میں ہو چکا ہے جب امتحاں ہمارا　　سیکھا زباں نے کہنا ہندوستاں ہمارا

رقبے کو کم سمجھ کر اقبالؔ بول اُٹھے　　ہندوستان کیسا، سارا جہاں ہمارا

لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم　　جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

فرمایا کرتے، جنگ میں فتح و کامیابی تو تکوینی مصلحتوں سے ہوتی رہتی ہے، مسلمان کا کام تو ہر قدم پر شریعت کا دامن پکڑے رہنا ہے، انجام جو کچھ بھی ہو، اصل مصیبت اس وقت یہ ہے کہ ہم نے خیال آخرت کو بالکل بھلا دیا، اور دامن صبر و رضا یکسر چھوڑ دیا ہے۔ خود تحریکؔ "آزادی" کیا ہے بس اپنی انانیت کا اشتہار ا کہہ گئے ہیں ؎

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم　　دلوں کو طاعت حق سے یہ دور کرتے ہیں

نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز　　ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

وقت اخیر آیا، تو خواجہ حسن نظامی پاس بیٹھے ہوئے تھے، اُن کا بیان ہے کہ نبض پر میرا ہاتھ تھا جب میں کلمہ لَا مَوْجُودَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا، تو ڈوبتی ہوئی نبض ایک بار پھر تیز ہو جاتی تھی۔

ستمبر ۱۹۲۱ء میں یہ پیر ظریف دنیا کو یاد آخرت اور توحید اور ترکِ معاصی کا سبق دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اکبر اگرچہ آپ کا ہُرّا نہ لے گیا
لیکن خدا کے دین کی گواہی تو دے گیا

بطور تکرار یہ عرض ہے کہ سخن فہمی اس نااہل کو آئی ہی کب، لیکن برائے نام جو کچھ بھی آئی بطفیل صرف دو بزرگوں کا ہے۔ ایک مولانا شبلیؒ کا اور دوسرے اکبر کا شعر کے ظاہری معنی و مطالب، ساخت و ترکیب، نشست الفاظ کی لفظی و ادبی خوبیوں کا جہاں تک تعلق ہے یہ مولانا شبلی کا فیض ہے۔ اکبر شعر کو کبھی ترنم کے ساتھ نہ پڑھتے۔ ہمیشہ سادہ، تحت اللفظ طریقے سے پڑھتے۔ مگر اس طرح ٹھہر ٹھہر کر، کہ پورا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا۔ اور شعر کی معنویت آئینہ ہو کر رہتی۔

محمد علی

(متوفی ۱۹۳۱ء)

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

لڑکپن کے شروع کا کوئی زمانہ تھا۔ نام سے ابتدائی تعارف اُسی وقت ہو گیا، علی گڑھ میگزین کے نام سے کالج کا ماہ نامہ آدھا انگریزی آدھا اردو میں نکلتا تھا۔ یہ محمد علی اس وقت تک ولایت جا چکے تھے، یا جانے والے تھے، کہ ان کا نام اس کے صفحات میں بہ طور پڑھنے والے یا کرکٹ کھیلنے والے کے نظر پڑا۔ اردو تو اُس وقت تک میں پڑھ لینے لگا تھا۔ اور انگریزی میں بھی کچھ شُدبُد ہو چلی تھی۔ چچا زاد بھائی عبدالحلیم اشرؔ نامی خدا معلوم کہاں کہاں سے اخبار اور رسالے لا لا کر دکھایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں علی گڑھ منتھلی میگزین بھی دیکھا، اور اس میں ان کا نام بھی۔ اس کے کسی پرچے میں یہ بھی پڑھا (غالباً سنہ ۱۹۰۰ء میں) کہ محمد علی نامی علی گڑھ کا ایک ذہین و فطین لڑکا علی گڑھ سے اب آکسفرڈ یونی ورسٹی گیا اور وہاں بھی نام پیدا کر رہا ہے۔ اُس کی ایک انگریزی نظم بھی علی گڑھ کرکٹ پر پڑھی۔ ایک شعر کا مضمون یہ تھا کہ جب لحیم و شحیم (Bulky) شوکت علی فیلڈ میں آتے ہیں تو کرکٹ کا بلا اُن کے ہاتھ میں wand نظر آتا ہے۔!

روائتیں سنتا رہا اور پڑھتا رہا۔ ملاقات و مکالمت کا شوق ہر قدم پر بڑھتا رہا۔ کامریڈ کلکتہ سے ۱۹۱۱ء میں نکلا اور اسے شروع ہی سے منگانا شروع کر دیا۔ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا تو اس کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا جلسہ راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں اُنھیں کی کوٹھی واقع قیصر باغ میں منعقد ہوا۔ دس پانچ تماشائی بھی جا بیٹھے، اُنھیں میں ایک میں بھی تھا۔ راجہ صاحب کے ہاں کے لوگ کچھ جانتے پہچانتے بھی تھے۔ تو پہلی زیارت یوں ہوئی۔ امین آباد پارک نیا نیا بنا تھا۔ اُس کے ایک بالا خانے پر ایک "مسلم کلب" سید میر جان

فرخ آبادی نے قائم کر دیا تھا۔ انھیں میر جان صاحب نے شام کے بعد مغرب کلب میں انھیں بھی (دوسرے مہمانوں کے ساتھ) بلا دیا تھا۔ اور وہاں انھیں قریب سے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔

۱۹۱۲ء میں کامریڈ کلکتے سے منتقل ہو کر دہلی آگیا اور اردو روزنامہ ہمدرد بھی یہیں سے نکلنا شروع ہو گیا۔ اسٹاف میں جو لوگ تھے وہ اپنے جاننے والوں میں سے تھے مضمون کی فرمائش آئی۔ مِل (انگریز فلسفی) کے عاشقوں میں اس وقت تھا۔ اس کی لبرٹی (Liberty) کے ایک باب کا ترجمہ کر کے بھیجا۔ یقیناً خشک معلوم ہوا ہوگا۔ کسی صاحب کا جواب محمد علی کے حکم پر آیا کہ "ترجمہ نہیں، اس مفہوم کو اردو میں اپنا کر بھیجو"

اخیر دسمبر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں جلسے ہوئے۔ کانفرنس کے اور یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی کے بھی۔ ملاقات کا تو کیا، چلتی پھرتی علیک سلیک کا موقع بھی نہ ہاتھ آتا۔

۱۹۱۳ء تھا اور غالباً برسات کا زمانہ، اب میں ملازمت کی تلاش میں تھا۔ ریلوے میں کوئی اچھی اور نئی جگہ نکلی تھی۔ ولایت علی قدوائی مولوی (علی گڑھ کی زبان میں "بمبوق") بارہ بنکی میں وکیل تھے، محمد علی کے شیدائی اور کامریڈ کے مستقل مضمون نگار۔ اُن سے تعارف نامہ لیا اور دہلی پہنچا کہ محمد علی کسی بڑے افسر سے سفارش کر دیں۔ اور دن بھر انھیں کا مہمان رہا۔ رمضان کا مہینہ تھا، محمد علی قدرتاً روزے سے تھے۔ مجھ اس وقت کے ملحد کو اس کی توفیق کہاں تھی۔ میرے لیے ناشتہ اور کھانا سب اپنے اپنے وقت پر موجود۔

کامریڈ سے میرا عشق بڑھتا رہا۔ اور ہمدرد سے بھی جو تعلق ہوا، وہ ترقی ہی پر رہا۔ فاروق (دیوانہ) گورکھپور والے، سید محفوظ علی، اور سید جالب دہلوی، قاضی عبد الغفار کئی کئی اسسٹنٹ ہمدرد میں تھے۔ محمد علی خود تو موقع بہت کم ہمدرد میں لکھنے کا پاتے، لکھوا اکثر دیتے۔ اسٹاف والوں میں سے کسی کو بلا کر اُسے سارے مطالب بتلا دیتے اور پھر اس کے لکھے ہوئے مقالے کا جائزہ بھی سختی سے لیتے۔ کم ہی کوئی ان کے معیار پر پورا اُترتا۔ کامریڈ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر غلام حسین تھے۔ علی گڑھ کے ایک پنجابی گریجویٹ، وہ محمد علی کو خاص طور پر عزیز تھے۔ انگریزی مزاحیہ لکھنے والوں میں

ولایت علی" بمبوق الھے۔ اردو مزاحیہ نویسوں میں سید محفوظ علی بدایونی تھے۔ مزاح نگاری میں اردو والوں کو صحیح راہ پر لگانے والے یہی تھے۔ ورنہ اس سے پہلے اودھ پنچ کا رنگ عام تھا۔ شکل وصورت، وطن، نسل، سب پر پھبتی، اور کبھی کبھی نوبت پھکڑ کی بھی آجاتی۔ پہلی جنگ یورپ ۱۹۱۴ء میں شروع ہو چکی تھی اور حکومت ہمیشہ سے زیادہ ذکی الحس ہو گئی تھی۔ لندن کے مشہور روزنامہ ٹائمز نے ایک مضمون Choice of The Turks لکھ کر ترکی کو جرمنی کی طرف سے شرکت جنگ سے ڈرایا دھمکایا تھا۔ محمد علی نے اس کا جواب اسی عنوان سے کامریڈ کے ۲۲ کالموں میں دیا اور تقریباً فاقہ کشی کر کے، یعنی صرف تھوڑی بہت چائے پی کر۔ ۲۲ کالم کی تصریح ذہن میں رکھیے۔

پرچہ اسکے بعد ضبط ہو گیا۔ اور خود محمد علی چھندواڑہ (سی۔پی) میں نظر بند کر دیے گئے۔ ہمدرد قدرتاً بند ہو کر رہا۔

۱۹۱۵ء کا اخیر تھا کہ میری انگریزی کتاب PSYCHOLOGY OF LEADERSHIP لندن سے ایک مشہور پبلشر F.Fisher unwin نے شائع کی۔ میں نے ایک نسخہ محمد علی کی خدمت میں چھندواڑہ بھیجا، جواب میں کتاب پر مفصل تنقید انگریزی میں آئی۔ کاغذ کے ۱۲، ۱۰ صفحوں پر۔ اس میں جہاں داد تھی، میرے اُس وقت کے ملحدانہ خیالات پر گرفت بھی اچھی خاصی تھی۔ پھر تو خط وکتابت شروع ہو گئی۔ خط کا جواب دیر میں آتا، لیکن جب آتا تو خوب دلچسپ اور مفصل سارے انتظار کی تلافی ہو جاتی۔ پہلے تو ایک ادھ خط انگریزی میں آئے، پھر میں نے لکھا کہ اردو میں لکھیے اس پر اردو میں آنے لگے۔ اور ایک خط میں تو اپنی شاعری کی پوری تاریخ ہی لکھ دی۔ افسوس ہے کہ اب یہ ذخیرہ میرے پاس محفوظ نہ رہا۔ ابھی چند ہی سال ہوئے کہ جواہر لال نہرو میوزیم (دہلی) والے میرے پاس آئے اور جواہر لال اور گاندھی جی کے جو دو ایک خط میرے پاس محفوظ تھے، انھیں کے ساتھ محمد علی کے خطوط بھی اصرار شدید کر کے لے گئے! یہ دلیل اُن کی لاجواب

تھی کہ آپ اتنی حفاظت کیسے کر یکیں گے، جیسی ہمارا میوزیم کرے گا۔

شاید ۱۹۱۷ئہ تھا کہ محمد علی، شوکت علی کسی عزیزہ کی شادی میں شرکت کے لیے چھندواڑہ سے اجازت خصوصی لے کر لکھنؤ کے راستے سے اپنے وطن رام پور گئے۔ میں ایسا موقع کیوں چھوڑتا لکھنؤ میں تو اس وقت تک رہتا ہی تھا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر " زندہ باد" کے نعرے لگنے شروع ہی ہوئے تھے، کہ محمد علی نے یہ روک کر ایک خوش لحن قاری سے سورۂ یوسف کے رکوع یاصاحبیِ السجن ءَاَرباب متفرقون خیر الخ کے سنانے کی فرمائش کر دی۔ بس پھر کیا تھا، سماں بندھ گیا پنجاب میل پر انگریز بہت سے سوار تھے، سب دنگ اور مبہوت۔ جب واپسی ہوئی تو میں لکھنؤ سے ٹکٹ لے کر رائے بریلی تک ساتھ گیا۔ محمد علی نے پہلے تو خوب ڈانٹا پھٹکارا کہ میرے "حافظ" یا نیم حافظ قرآن ہونے پر تو خطوں میں طنز و تشنیع کرتے رہتے ہو۔ اس وقت میں انگریزیت میں غرق تھا۔ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ گویا حرزجان رہتا تھا۔ اس کا مستقل خریدار تھا۔ اس کا تازہ نمبر ہاتھ میں تھا۔ محمد علی کا جوش تبلیغ اتنا تھا کہ بے اختیار اُبلا پڑتا تھا، کسی کے روکے نہ رک سکتا۔ کبھی فرماتے کہ " رہائی پاتے ہی یورپ کا قصد ہے، تبلیغ ہی کی غرض سے۔" اقبال کی فارسی مثنویوں کے گویا حافظ ہو گئے تھے اور قرآن مجید کے بعد اسرار خودی اور رموز بیخودی کی شاید سب سے زیادہ تلاوت کرتے۔

چھندواڑہ کی نظر بندی کے بعد کچھ مدت بیتول جیل میں گزاری۔ جب رہائی ہوئی۔ تو کانگریس کے کام میں جُٹ گئے۔ اور گاندھی جی کے نائب کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہو گئے۔ نعرے "اللہ اکبر" کے علاوہ دو ہی رہ گئے تھے ایک " مہاتما گاندھی کی جے" دوسرا "محمد علی شوکت علی کی جے"، لکھنؤ دو بار آنا ہوا۔ ایک بار گاندھی جی کے ساتھ۔ قیام دونوں بار فرنگی محل میں۔ گاندھی جی کے ساتھ جب آئے، تو بجائے ان کی ہمسری کے اپنی حیثیت محض ان کے نقیب کی رکھی۔ اسی اُلٹ پھیر میں دینی درس گاہ نظامیہ سے مولانا عبدالباری کی جانب سے "مولانا" کی اعزازی سند بھی مل گئی۔ اور ان کی دوبارہ گرفتاری کا زمانہ آگیا۔ غالباً ۱۹۲۱ئہ تھا، اور ایک کراچی میں ایک تقریر کی بنا پر۔ کہا یہ تھا کہ انگریزی نوکری حرام ہے، خصوصاً فوج میں بھرتی۔ گرفتاری ریل پر سفر کرتے ہوئے ہوئی۔ غالباً والیٹرا اسٹیشن پر علاقہ

مدراس میں۔ ادر مقدمہ بڑا معرکتہ الآرا رہا بالآخر سزا دو سال کے جیل کی ہوئی۔ ادھر اُن کا جیل جانا تھا کہ اُدھر ان کے نام کا سکہ سارے ملک میں چلنے لگا۔ کیا شہر اور کیا دیہات، ہر طرف اُن کی جے پکاری جانے لگی۔ اور لکھنؤ میں دو نظمیں تو ایک ایک کی زبان پر چڑھ گئیں، ایک کا مصرع تھا۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو" دوسرے کا تھا "ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو"۔ اور اگر پہلی نظم کسی خوش آواز نے زہر عشق کی درد انگیز دُھن میں پڑھ دی تو سننے والا تو بے اختیار ہی ہو جاتا اور سُنانے والے کی کہنا چاہیے کہ ہچکی بندھ جاتی۔

محمد علی کو غزل گوئی خصوصًا نعت گوئی کا موقع پہلی دفعہ کی نظر بندی (چھندواڑے) میں اچھا خاصا مل گیا تھا۔ ان کی مشہور ترین غزلیں، اسی زمانے کی ہیں۔ قوالوں (خصوصًا بانسۂ بڑے گاؤں، دریاباد کے قوالوں) نے بھی ان کو خوب چمکایا۔ کلام جوہر کے ایڈیشن بار بار نکلے۔ اور اس خاکسار کے ایک مقدمے کے ساتھ۔ دریاباد کے قوالوں نے کلام جوہر ایک بار عُرس اجمیر کے موقع پر گاندھی جی کو سنایا۔ اور ڈاکٹر سید محمود انگریزی میں ترجمانی کرتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ دوبارہ چھوٹے اور اپنی لڑکی کی شدید علالت کو سن کر بھوالی (پہاڑ) گئے۔ میں وہیں جا کر ملا۔ اور پھر اُن کی آمد و رفت لکھنؤ اکثر ہونے لگی۔ قیام اب مستقل دہلی میں تھا۔ اور کامریڈ اور ہمدرد کے اجرائے ثانی میں ابھی کچھ دیر باقی تھی، لکھنؤ میں قیام اپنے مرشد مولانا عبد الباری صاحب کے ہاں ہی کرتے۔ میں اب لکھنؤ سے دریاباد منتقل ہو گیا تھا۔ مجھے اطلاع ہو ہی جاتی، میں دریاباد سے لکھنؤ آکر اکثر تو اسٹیشن ہی پر مل جاتا، اور وقت کا بیشتر حصہ انھیں کے ساتھ گزارتا، آخر انھیں دہلی کی گاڑی پر رات کو بٹھا کر دریاباد واپس چلا آتا۔ ایک بار کیا ہوا کہ فرنگی محل میں رات زیادہ آچکی تھی۔ مولانا سونے کے لئے لیٹ چکے تھے۔ لیٹے لیٹے مجھ سے فرمایا کہ تمھیں مہاتما جی کی عقیدت میں بڑا غلو ہو گیا ہے، تم ان کی دینی عظمت و روحانی کرامت کے بھی قائل ہو گئے ہو، مجھے دیکھو۔ مجھ میں یہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں انھیں اپنا

سیاسی لیڈر مانتا ہوں اور ان کی پیروی میں آخری حد تک جانے کو تیار ہوں، ملک کی آزادی کے لئے انھوں نے وہ کام کیے جو آج تک کوئی نہیں کر سکا تھا۔

ابھی جو قید سے چھوٹے ۱۹۲۳ء میں تو اللہ نے ایک اور آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ لڑکا تو کوئی تھا ہی نہیں، لڑکیاں چار تھیں ان میں منجھلی آمنہ بچاری دق میں مبتلا تھی، الموڑہ کے قریب بھوالی میں۔ وہاں پہنچے۔ میں بھی ملنے وہیں گیا۔ تین دن بعد انھیں کے قافلے کے ساتھ لکھنؤ واپس آیا۔ انھیں اپنے مرشد سے ملنے کی بھی جلدی تھی۔ سفر کی مدت کے علاوہ لکھنؤ کے قیام میں بھی ساتھ رہا۔ کسی آریہ سماجی نے پرچہ چھاپ دیا کہ یہ کیسے ہندوستانی ہیں علانیہ کہتے ہیں کہ "ایک فاسق مسلمان بھی گاندھی جی سے بہتر ہے"۔ شام کو جلسہ امین آباد پارک میں زوروں پر ہو رہا تھا۔ اور چودھری خلیق الزماں صدر تھے۔ ایک شخص نے وہی پرچہ بصورت سوال پیش کر دیا۔ صدر نے کہا کہ میں مباحثے کی اجازت نہیں دیتا۔ محمد علی برجستہ بولے، "مگر میں اجازت دیتا ہوں" اور یہ کہہ کر تقریر شروع کر دی۔ مسئلے ایک نہیں دو ہیں۔ ایک تو توحید و رسالت کا عقیدہ ہے، جو کوئی بھی اس کا قائل ہے میں اس کو بہتر کہنے پر مجبور ہوں۔ اس کی عملی زندگی چاہے جیسی بھی ہو، مجھے بحث اس کی عملی زندگی سے نہیں، اُس کے عقیدے سے ہے۔ برخلاف اس کے جس کا عقیدہ یہ نہیں۔ اس کی عملی زندگی جتنی بہتر ہو اور کیسی ہی اعلا کردار کی مالک ہو، بہرحال عقیدے کے لحاظ سے پست و حقیر ہی ہے۔ میں سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مہاتما جی کو کتنا بہتر سمجھوں، یہاں تک کہ اپنی والدہ ماجدہ، اپنے پیر و مرشد سے بھی بڑھ کر، لیکن عقیدے کے اعتبار سے ہر کلمہ گو اُن سے بہتر ہے۔ کیا مالوی جی کا یہی عقیدہ ہندو مت سے متعلق نہیں؟ اگر نہیں تو وہ گویا ہندو عقیدے اور اسلامی عقیدے کو ایک درجے پر رکھ رہے ہیں اور کیوں خود مسلمان نہیں ہو جاتے؟

اسلامیت کی دُھن ایسی تھی جو ان کے سارے عقلی و ذہنی کاروبار پر شدومد کے ساتھ

غالب رہتی۔ اور جرأت و ہمت اور بے باکی کے لحاظ سے تو میں نے انھیں بے نظیر پایا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے دباؤ یا مروت اور اثر میں کسی حد تک ضرور ہوتا ہے۔ مستثنا اگر پایا تو ایک محمد علی کو ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ قال نہیں حال تھا، آخر میں یہی بالکل حال بن کر رہ گیا تھا۔ آج اس سے مخالفت، کل اس سے۔ اپنے ہی سکھائے پڑھائے ہوؤں کی طرف سے بیگانگی۔ بڑے بڑے مخلصوں اور پرانے دوستوں سے علیحدگی۔ بیماریوں پر بیماریاں، جسمانی معذوریوں پر معذوریاں مستزاد!

اکتوبر ۱۹۲۴ء سے کامریڈ اور ہمدرد دونوں کا اجرائے ثانی کر دیا تھا۔ کامریڈ کو تو غلام حسین مرحوم کے بعد کوئی قابل اعتماد اسسٹنٹ ایڈیٹر نہ مل سکا۔ البتہ ہمدرد کو سید محمد جعفری جامعی وغیرہ ہاتھ آ گئے تھے۔ دونوں پرچے چلے تو خوب، لیکن کوئی اچھا مینیجر نہ ہاتھ آیا۔ اور خود مولانا پر لیڈری کے سلسلے میں کام کا بوجھ بے حد پڑ گیا تھا۔ بڑے اَن تھک کام کرنے والے تھے، لیکن بہرحال بشر ہی تھے۔ آج یہاں جا رہے ہیں، کل وہاں ملک ہی کے ہر طرف سے بلاوے آتے، تار سے بھی اور خطوں سے بھی، لوگ بلانے کے لئے وفد بن کر بھی پہنچتے۔ مخالفتیں اور بیماریاں مستزاد۔ مجبوراً دونوں پرچے بند کرنا پڑے۔ کامریڈ تو شروع ۱۹۲۶ء ہی میں ختم ہو گیا اور اس کے بند ہونے سے مجھے ایسا ہی رنج ہوا جیسے کسی عزیز یا دوست کی موت پر ہوتا ہے۔ ہمدرد کسی طرح گھٹتا، گھسٹتا ہوا مارچ ۱۹۲۹ء تک چلا۔

وسط اپریل ۱۹۲۸ء میں ایک غیر مسلم مہاراجہ الور نے مولانا کو اپنے خرچ پر یورپ بھیجا ذیابیطس کا علاج کرانے۔ مولانا تو ہمدرد کو اسی وقت بند کر رہے تھے، میرے اور ظفر الملک علوی کاکوروی کے اصرار پر جاری رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ شعبۂ انتظامی کے نگرانِ کار علوی صاحب رہے اور شعبۂ ادارت کا میں۔ میرا نام اُس وقت بطور نگراں ہمدرد کے ہر پرچے پر نکلنے لگا۔

قرآنی اقتباس پر تشریحی ترجمہ کی عبارت ہر روز دیتا ہی، اداریہ بھی وقتاً فوقتاً لکھ دیتا، کبھی کبھی کتابوں پر تبصرہ بھی۔ میں مارچ ۱۹۲۹ء میں حج کو گیا ہوا تھا کہ جبھی مولانا نے سفر یورپ سے واپسی پر عاجز آکر پرچہ بند کر دیا۔ میں مدینے میں تھا، جب خبر ہوئی، دل کو بڑا ہی رنج و صدمہ ہوا۔

بصارت میں بہت ہی فرق آگیا تھا۔ اور ذیابیطس کی پیچیدگی نے طرح طرح کی شکایتیں اور پیدا کر رکھی تھیں۔ آخر جب نیک دل و شریف طینت وائسرائے لارڈ اروِن کی دعوت پاکر دہلی سے شملہ جاکر وائسرائے کے ڈاکٹر سے علاج شروع کرایا۔ مولانا کو اسٹریچر پر لٹا کر اسپتال میں کیبن سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا، کہ ایک انگریز خاتون نے ترس کھاکر سوال کر دیا، کہ ان بڑے میاں (مولانا کا اصل سن اُس وقت کل ۵۰، ۵۱ سال کا تھا، لیکن صورتاً ۷۰ سے اوپر معلوم دیتا تھا) کو کیا بیماری ہے؟ تو ساتھ کے ڈاکٹر نے کہا کہ یہ نہ پوچھو، یہ پوچھو کون سی بیماری انھیں نہیں ہے۔“

اس مجموعۂ امراض یا زندہ جنازے کو جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے اخیر ۱۹۲۹ء میں لد پھند کر جب بھائی اور بیوی کے ساتھ لندن جانا پڑا تو اس وقت بھی اس شیر دل کے مُنھ سے یہی نکلا، کہ ”افضل الجہاد یعنی سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی سعادت حاصل کر دوں“ بمبئی سے جب جہاز پر سوار کرائے جا رہے تھے تو ایک مخلص اور وقت کے مشہور خطیب مولانا عبدالماجد بدایونی نے پوچھا، کہ آخر اس حال میں آپ کیوں جا رہے ہیں؟“ جواب برجستہ دیا کہ ”مرنے کو“۔ زندگی کی آخری سانس تک اس مرد مجاہد نے یہ فرض پورا کیا بھی، علی گڑھ اور آکسفرڈ دونوں کی تعلیم و تربیت سے انہوں نے پورا فائدہ حاصل کیا تھا۔ اور مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی آنریری ڈگری ”مولانا“ سے بھی۔ دینی مسائل پر اُن کی نظر اچھی خاصی وسیع بھی تھی اور گہری بھی، کسی عام مولوی سے کم نہیں، اور ان کی انگریزی قابلیت کا تو کہنا ہی کیا۔ اردو کا بھی ادبی و شعری مذاق حیرت انگیز حد تک اعلا تھا، ذہانت، فطانت، خوش فکری خوش تحریری، خوش تقریری، تاریخ عالم، تاریخ اسلام، کسی میں ان کا قدم شاید کسی معاصر سے

پھیکا نہ تھا، اور بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے تو گویا بادشاہ تھے۔ عشق رسولؐ، عشق اسلام، عشق قرآن میں اپنے نظیر آپ تھے۔

۱۹۲۶ء میں موتمر اسلامی (مکہ معظمہ) میں جب سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف تقریر کرتے انھیں کے سامنے کھڑے ہوئے تو کہا:۔

"لوگ مجھے ڈرا رہے ہیں کہ سلطان کی مخالفت شاہی آداب کے منافی ہے اور انتہائی خطرناک، میں ایسوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ جب یہ زبان وزیر اعظم برطانیہ لائیڈ جارج کے سامنے کلمۂ حق سے نہ رُکی، جو والی نجد و حجاز سے کہیں زیادہ طاقت رکھتا تھا، تو پھر یہاں تو ایک مسلمان کے سامنے حرم میں کھڑا ہوا ہوں، جہاں جانوروں کا بھی شکار نہیں کیا جا سکتا۔"

شریفی سعودی فتنہ ہندوستان میں مدت سے قائم تھا۔ اخیر ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء ہوگا کہ سیتاپور میں ان کے دوران تقریر کسی نے اعتراض کر دیا کہ "مسئلہ حجاز میں آپ خود اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خلاف کیسے جا رہے ہیں۔ آپ سلطان ابن سعود کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ کے مرشد ان کی مخالفت"؟ محمد علی نے جواب دیا۔

"میں نے مرشد کا دامن فنا فی الشیخ ہونے کے لئے نہیں، فنا فی اللہ کی خاطر پکڑا تھا۔ جس معاملے میں میں گمراہی پر ہوں، صحیح راستہ بتانا اُن کا حق ہے اور میرا فرض اس کو قبول کرنا۔ لیکن جس معاملے میں میں بصیرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہاں اسی طرح میرا فرض ہو جاتا ہے کہ میں انھیں سیدھی راہ دکھاؤں۔" حق گوئی کی یہ مثالیں اب ڈھونڈھے سے بھی ملنا مشکل ہیں۔ بڑے زندہ دل، ہنسنے ہنسانے والے تھے۔ لیکن اس سے بھی شاید بڑھ کر رقیق القلب رونے رلانے والے بھی! اخیر عمر میں ذیابیطس کے مریض ہو کر پیشاب کے لئے رات میں بار بار اُٹھتے، اسی لئے فجر کی نماز مشکل سے مل پاتی۔ وقت تھوڑا بہت باقی ہوتا، لیکن بجائے جلدی کرنے کے، یہ پورے اطمینان سے غُسل کرتے، اور نماز قضا پڑھتے۔ لیکن قرأت قرآن

پورے اثر کے ساتھ کرتے۔ اور بعض وقت نماز میں رو پڑتے۔ تلاوت قرآن کے وقت بھی اسی خشوع اور اسی انابت کی تصویر بنے ہوتے۔ خصوصاً ان آیتوں کی تلاوت کے وقت جن میں منافقین پر وعید و تہدید ہوتی۔

دل میں جائز حوصلے اور ولولے دنیاداروں کے سے رکھتے، لیکن خدا معلوم کیسے تقریباً ہر موقع پر دل مار کر رہنا پڑتا۔ ماں بڑی عابدہ تہجد گزار ملی تھیں، کم سنی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں، مذہبی تربیت انھیں نے لڑکوں کو دی تھی۔ جب دونوں بھائیوں کو چھندواڑے میں نظربندی کو عرصہ ہو چکا تھا، تو خبر یہ مشہور ہوئی کہ گورنمنٹ کسی ذی اثر ذریعے سے ایک مسودہ معافی نامے کا ان کے پاس چھندواڑہ بھیجنے والی ہے اس پر دستخط کر دینے سے دونوں کو رہائی مل جائے گی۔ بی اماں کو جب خبر پہنچی تو لڑکوں کے پاس کہلا بھیجا کہ "اگر کسی بھی معافی نامے پر دستخط کا تم لوگوں نے ارادہ کیا تو قبل اس کے کہ دستخط کر سکو اپنے انھیں بوڑھے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی" ـــــ اس شیر دل ماں کی اولاد اگر شیر دل نہ ہوتی تو اور کیا ہوتی!

محمد علی نے آخری تقریر میں اپنے زار و نزار ہونے کے باوجود کہہ دیا تھا کہ :-

"اگر میرے ملک کو آزادی نہ دی تو میرے لیے یہاں قبر کی زمین دینا ہوگی"

بے شک قبر کے لیے زمین ملی، مگر کسی دارالکفر میں نہیں، بلکہ فلسطین کے مفتی امین الحسینی کی درخواست پر بیت المقدس میں! مسجد عمرؓ کے پائین میں، اور اقبال کو سوجھ گئی کہ یہ مصرع کہہ ڈالا۔

"سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت!"

ماتم گسار ملت کی زباں پر یہ شعر آتا رہتا ہے ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر نشناخت دریغ

محمد علی لاہوری

(متوفی ۱۹۵۱ء)

۱۹۰۹ء تھا اور میں کیننگ کالج لکھنؤ میں انٹرمیڈیٹ کے سکنڈ ایر کا طالب علم کہ انگریزی میں دہریوں، لامذہبوں، لاادریوں (Agnostics) کی تحریروں کے پڑھنے سے اچھا خاصا مسلم ومومن سے ملحد (لاادری) بن گیا اور ذات رسالت سے خصوصی سوء اعتقاد بلکہ کفر والحاد پیدا ہوگیا۔ تصویر ایک مستند انگریزی مرقع میں خوف ناک خشم آگیں چہرے کے ساتھ دیکھنے میں آئی، جیسے محض جنگ جو سرداروں کی ہوتی ہے۔ اور پھر طبی کتابوں میں پڑھ لیا تھا کہ "وحی" تو صرع کی طرح ایک نفسیاتی مرض ہوتی ہے، وغیرہا۔

یہ ارتداد ۱۹۱۸ء تک قائم رہا۔ ۱۹۱۹ء میں ہندو فلسفہ اور یوگ اور ہندو روایات کو پڑھ پڑھ کر، خصوصاً مسز بسنٹ اور رشی بھگوان داس کی تحریروں سے اس مرض سے افاقہ ہوا (ازالہ نہیں)۔ اسی وقت مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی پہلی جلد نکلی تھی، جس کا اثر یہ پڑا کہ حضورؐ نعوذ باللہ کوئی جنگ جو قسم کے سردار نہیں بلکہ بڑے مصلح قوم (رفامر) اور شفیق، نرم دل سردار قوم تھے، دوسری کتاب عین اسی زمانے میں انھیں محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن ایک عزیز کے پاس پڑھنے میں آئی، جس نے یہ دل میں اتارا، کہ قرآن نعوذ باللہ کوئی سنی سنائی کہانیوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ بہت ہی گہری اور حکیمانہ حقیقتوں کا جامع ہے اور اگر "آسمانی" نہیں تو تقریباً "آسمانی" تو ضرور ہے۔ اس کے بعد ان کی اور کتابیں پڑھیں، سیرۃ خیر البشر اور مقام حدیث اور خلافت راشدہ۔ سب ہی اچھی معلوم ہوئیں اور سب سے بڑھ کر ان کی اردو تفسیر بیان القرآن تین جلدوں میں۔ جا بجا اس میں "روشن خیالی" یا نیچریت تو ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی بڑی قابل قدر

ہے، اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش دل پر ثبت کردینے والی خصوصاً جس زمانے میں لکھی گئی تھی، اُس کے لحاظ سے۔

لاہور میں ایک بار مفصل، ملاقات بھی ہوئی غالباً ۱۹۴۲ء میں۔ میں پشاور لکچر دینے جارہا تھا، راستے میں لاہور بھی اُترا تھا، اور ان سے مل کر بھی اچھا اثر پڑا۔ چہرہ بشرہ ایک عبادت گزار، تہجد گزار کی نورانیت رکھتا تھا۔ باقی جس مسئلے میں وہ غلطی میں مبتلا ہو گئے (مرزا صاحب کو وہ نبی ہرگز نہیں مانتے تھے، البتہ ایک بزرگ ضرور تسلیم کرتے تھے) اللہ انھیں معاف فرمائے۔

اُنھیں کے گروہ کے ایک اور رکن خواجہ کمال الدین تھے۔ ان سے دو تین بار ملاقات ہوئی ہر بار ان کی غیرت دینی اور حمیت اسلامی سے بہت ہی متاثر ہوا۔ انھوں نے بھی انگریزی میں پبلک کے سامنے ایک بڑا تبلیغی کام کردیا ہے۔ اپنی انگریزی تصانیف کے ذریعہ سے جمہور اُمت کو یہ چاہیے تھا کہ لڑا جھگڑا کر نہیں بلکہ اپنے حسن تدبیر سے اس گروہ کو رفتہ رفتہ اپنے اندر جذب کرلیں۔

مولانا شوکت علی

(متوفی ۱۹۳۸ء)

شوکت علی، کی بڑائی کے لئے یہی کافی ہوتا، کہ وہ محمد علی کے بڑے بھائی تھے۔ لیکن ان میں بڑائی کے کچھ اوصاف خود بھی تھے اور اس نے لوگوں کو ان کے گرد اکٹھا کر لینے میں بڑی مدد دی۔ لوگوں میں اپنی وقتی شہرت و ہر دل عزیزی اُن پہ قابو حاصل کر لینے میں ملکہ حاصل تھا۔ موتی لال نہرو اور مالوی جی تک کو اُن سے گرویدگی تھی۔ علی گڑھ کرکٹ ٹیم کی کپتانی شروع شروع انھیں کیا مل گئی تھی کہ وہ ملت بلکہ قوم و ملت دونوں کی ہر ٹیم کی کپتانی کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔

"مولانا" وہ نام کے بھی نہ تھے۔ عربی سے اُنھیں مَس نہ تھا۔ نہ کوئی اور علمی ذوق رکھتے تھے۔ ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سرپرست مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل نے ان کی خدماتِ ملت کو دیکھ کر "مولانا" کی آنریری ڈگری ان دونوں بھائیوں کو اپنی درس گاہ سے دے دی تھی۔ بس جب ہی سے لقب "مولانا" لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا۔ اور شوکت علی کے نام کا ایک جزو بن گیا۔ ایک دوسرا ایسے ہی نام کے "مولانا"، یعنی ظفر علی خاں نے اپنے عوامی روزنامے زمین دار کے ذریعہ اس تعظیمی و اعزازی لقب کو عام کر دیا۔

لحیم و شحیم گران ڈیل، دیو ہیکر زبان بھی قد و قامت ہی کی مناسبت سے لمبی اور تیز۔ چندہ وصول کرنے کے فن میں استاد کامل، چندہ مانگنے کی مستقل عادت، سرسید اور محسن الملک کو اللہ معاف کرے کہ انھیں سے شوکت علی نے لی۔ اور یہ لت کچھ ایسی تکلیف دہ کہ لوگ اُکتا جاتے اور بڑے بڑے بے تکلف اور مخلص دوست بھی سامنا کرنے اور چندہ باز سے کترانے لگتے۔ اور چندہ مانگنے والا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی نظر میں حقیر اور بھک منگا اور یوسف بے کارواں ہو کر رہ جاتا!

خاندان مراد آباد کا تھا اور رام پور میں آبسا تھا۔ رام پور اُس وقت ایک مسلم ریاست تھی

جو سُنی فرمان رداؤں کے بعد شیعہ فرماں رداؤں کے تحت میں چلی گئی۔ وقت کے فرماں ردا، اب کیا اُن کا نام لیا جائے، اور کیا اُن کے اوصاف گنائے جائیں! بہر حال یہ حضرات علی برادران کے حق میں خاصے سنگ دل، بلکہ رئیس الاشقیاء نکلے۔

والدہ کم سنی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں، بی اماں کے نام سے مشہور تھیں اور ایک بزرگ بیوی تھیں۔ عابدہ، زاہدہ، تہجد گزار۔ اخیر عمر میں شرعی پردہ اور بُرقع کے ساتھ باہر نکلنے، ملک میں دورہ کرنے اور بیٹھے بیٹھے تقریریں کرنے لگی تھیں۔ ایک بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں بی اے، قادیان جاکر مرزا صاحب کی "نبوت" پر ایمان لائے تھے۔ میں ان سے بھی ملا ہوں۔ بڑے مہذب و شائستہ اور کھرے مذہبی آدمی تھے۔ شوکت صاحب محمد علی کو بہت ہی جی جان سے زیادہ چاہتے تھے۔ سِن میں سات آٹھ برس کا فرق ہونے کے باوجود بڑی بے تکلفی تھی۔ خود محمد علی کا تخلص جوہر تھا، اور بڑے بھائی ذوالفقار کا تخلص گوہر۔ یہ منجھلے بھائی شاعر نام کے بھی نہ تھے۔ ان کا تخلص محمد علی نے رکھ دیا تھا شوہر۔ بے تکلفی بالکل ہم جولیوں کی سی تھی۔ اس کے باوجود سِن کی بڑائی سے فائدہ اٹھانے میں حضرت چوکتے ہی نہ تھے۔ بعض دفعہ ڈانٹ بھی بری طرح دیتے تھے۔ باپ محمد علی کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ تعلیم تربیت پھر ولایت بھجوانے کا انتظام سب انھیں بڑے بھائی ہی نے کیا تھا۔ اخبار والوں نے دونوں بھائیوں کو مُلکی و ملّی تحریکوں میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اور وابستہ دیکھ کر "علی برادران" لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی نظر میں یہ دھوکا ہوتا کہ کوئی تاجر ہیں، اور فرم کا نام مشترک رکھتے ہیں۔ محمد علی ہی نے بڑے بھائی کو انگریزی پریس میں (Big Brother) کے لقب سے مانوس و معروف کر دیا تھا۔

شوکت صاحب علی گڑھ سے گریجویٹ ہونے کے بعد سرکاری محکمۂ افیون میں ایک اچھے عہدے پر ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں جب مسلم یونی ورسٹی کا غلغلہ بلند ہوا تو پہلے لمبی چھٹی لیکر سر آغا خاں کے پرائیوٹ سکریٹری بن گئے اور ہندوستان بھر میں گشت لگاتے پھرے، اور پھر قومی یا ملی کام کرنے کے لئے پنشن بھی لے لی۔ علی گڑھ کے اولڈ بوائز لاج میں ان کا اجلاس

کیا ہوتا۔ پورا "دربار" لگتا!

۱۹۳۰ء کے آخر میں جب محمد علی گول میز کانفرنس میں لندن جانے لگے تو یہ بھی اُن کے ساتھ ہی گئے۔ اور وہ جب وہیں سے جنت کے راہی ہوگئے تو یہ اکیلے رہ گئے۔ پھر بھی ہمت سے کام کی دُھن میں لگے رہے اور جب خلافت کے نام میں کچھ بھی کشش نہ رہی تو مسلم لیگ کے کام میں جُٹ گئے اور لیجلیٹو اسمبلی کے ممبر بھی بنے۔ دہلی میں قیام تھا کہ اللہ کے ہاں سے بلاوا آگیا۔ جامع مسجد کے بائیں میدان میں سرمد کی تربت کے پاس ہی مدفون ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنازے میں مخلوق خدا اُمڈی پڑتی تھی۔ اپنے لئے کہا کرتے تھے کہ" اگر ہم بدمعاش بھی ہیں تو اللہ میاں کے بدمعاش ہیں۔

"آم کی دعوت" کہہ کر شروع برسات میں گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ۱۹۲۵ء میں میں نے بھی دریاباد بلایا اور اصلاً مدعو تو محمد علی کو کیا تھا، انھیں طفیلی سمجھ رہا تھا۔ لیکن عین وقت پر اتفاق سے محمد علی بیمار ہوگئے اور تنہا یہی آئے۔ جو کچھ جوڑ بٹور کر چندہ جمع کیا تھا انھیں کے کام آگیا۔ بہت خوش واپس گئے۔ کھانے کی فرمائش زبان سے غضب کی کرتے تھے۔ میزبان بےچارہ ڈرجاتا کہ پورا دیوالہ نکلوا کر رہیں گے۔ لیکن واقعتاً بہت کم کھاتے، کھانے کا ہنگامہ ہی زیادہ مچاتے ذیابیطس کا مرض تھا۔ پرہیز اچھا خاصا رکھتے۔ نمازیں ناغہ نہ ہونے دیتے۔ اُلٹی سیدھی جیسی بھی بن پڑتی، وقت ہی پر پڑھ لیتے ——— اپنی ذات میں بالکل منفرد تھے۔

گاندھی جی

(متوفی ۱۹۴۸ء)

سنہ ۱۹۲۰ء کا کوئی مہینہ تھا اور "مہاتما جی" کے عین شباب شہرت کا زمانہ، کہ وہ صبح سویرے کی گاڑی سے لکھنؤ پہنچے۔ تحریک خلافت و ترک موالات کی پر زور بھیڑ تھی، اسٹیشن پر میرے بالکل قریب سے گزرے۔ آنکھیں نیچی چہرہ پُر سکون۔ بُشرے پر ریاضتوں کا غازہ، اُس وقت کرتا اور ٹوپی جزو لباس تھے۔ تصویر بار بار کی دیکھی ہوئی تھی۔ اور نام تو بے شمار بار کانوں میں پڑ چکا تھا۔ دیکھا تو نقشہ ویسا ہی پُر اثر پایا، جیسا سُنا تھا اور تصویروں میں پایا تھا بلکہ اُس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ محمد علی ہم راہ بہ طور ایک مساوی لیڈر کے نہیں محض نقیب بنے ہوئے، چاکری کرتے ہوئے، موٹر کی سواری اس وقت تک اتنی عام نہیں ہوئی تھی، جوڑی گاڑی نے فرنگی محل کی محل سرا تک پہنچایا۔ محمد علی کوچ بکس پر بیٹھے رہے۔ رئیسوں اور لیڈروں کی بھیڑ بھاڑ چھوڑ، "مہاتما" "مولانا" کے ہاں فروکش ہوئے۔ مولانا عبدالباری کے ہاں، جو سیاسی لیڈروں کی صف اول میں اس وقت تک آ چکے تھے ——— اِدھر سے میزبانی اور اُدھر سے مہمانی خوب دیکھ لی۔ گاندھی جی کی غذا اس وقت تک بکری کا دودھ اور کشمش وغیرہ، بعض خشک اور تر پھل تھے۔ ایک اچھی دودھاری بکری اور وافر تعداد میں ان پھلوں کا انتظام لوازم مہمان داری میں تھا۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں دوبارہ گاندھی جی کے درشن اجمیر میں ہوئے۔ عرس سالانہ کے موقع پر مولانائے فرنگی محلی کی پارٹی عرس میں شرکت کے لئے لکھنؤ سے روانہ ہوئی۔ اس پارٹی کا ایک ضمیمہ میں بھی تھا۔ محمد علی جیل میں تھے۔ درگاہ میں رات کو قوالی کے وقت گاندھی جی کے سامنے مولانا محمد علی کی غزلیں گوائی گئیں۔ میں زندگی کے اس عبوری دور میں بزرگان چشتیہ کا نہایت معتقد اور قوالی سننے والا تھا۔ اپنے دریابادی قوال میاں افضل کی چوکی کو ساتھ لیتا گیا تھا اُنھیں سے قوالی کرائی۔ مسلم نیشنلسٹ لیڈر ڈاکٹر سید محمود بابس

ہی بیٹھے غزلوں کا انگریزی ترجمہ گاندھی جی کو سمجھاتے جاتے تھے۔ اجمیر ہی میں ایک دن موقع ذرا تنہائی کا مل گیا، اور میں نے ایک مختصر اخباری بیان گاندھی جی سے لے ڈالا۔ بیان سیاسی نہیں، مذہبی واعتقادی رنگ کا تھا (سیاسی بیان تو مہاتما جی کے ہر روز چھپتے ہی رہتے تھے) گاندھی جی کا مذہبی مطالعہ بدستور جاری تھا۔ اور راڈول کا انگریزی ترجمۂ قرآن گاندھی جی کے ساتھ سفر میں بھی رہتا تھا۔ گفتگو انگریزی میں تھی۔

پہلا سوال یہ عرض کیا کہ آپ کا خدا سے متعلق کیا خیال ہے؟ عام ہندوؤں کی طرح بہت سے اوتاروں کے قائل ہوں گے؟

بولے: جی نہیں، میں کامل توحید کا قائل ہوں۔

"I PERFECTLY BELIEVE IN UNITY OF GOD."

پھر سوال ہوا، "اور ہمارے رسول کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

بولے "میں انھیں دنیا کا مُعلّم سمجھتا ہوں۔"

I, BELIEVE HIM TO BE A WORLD TEACHER."

میں نے کہا کہ "اُس مُعلّم یا ہادی کو ہم لوگ اپنی اصطلاح میں پیمبر کہتے ہیں۔"

اس پر خاموش رہے اور کچھ زبان سے جواب نہ دیا۔ سکوت سے اشارتًا اثبات یا تائید نکل سکتی ہے۔ اپنا خیال ہے کہ گاندھی جی توحید کی حد تک تو مسلمان تھے۔ اور خدائے واحد ہی کو خالق، کارساز اور حکمراں سمجھتے تھے۔ اصل اشتباہ و مغالطہ انھیں مسئلہ وحی میں رہا۔ آریائی نسل کے عام طرزِ تخیل و تفکر میں انھیں ٹھوکر اسی مسئلہ وحی و رسالت ہی میں لگی۔ اوتار یا حلول کا عقیدہ تو ان کی سمجھ میں آ ہی گیا ہے۔ یعنی یہ کہ خالق کسی مخلوق کا قالب اختیار کر کے دنیا میں آ گیا۔ لیکن رسالت سمجھ میں نہیں آئی۔ یعنی یہ کہ خدا کسی بندۂ خاص کو اپنا پیام رساں بنا کر بھیجتا ہے، اور سارا کلام و پیام بندوں سے اُسی کے ذریعہ و واسطے سے کرتا ہے، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا ــــ رسول اور نبی ان کے نزدیک بڑے انسان ہوا کرتے تھے، نہایت درجہ

قابل احترام، مصلح، محسن انسانیت ہو کر آتے تھے۔ گاندھی جی مسلمانوں کے مخلص، بہی خواہ، ہمدرد تھے، ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہندو اسے برداشت ہی نہ کر سکے کہ مہاتما جی ۵۵ کروڑ کی رقم چپ چپاتے ہندوستان سے پاکستان کو دلا دیں۔ اور اسی طرح اس اکثریت نے اسے بھی معاف نہ کیا کہ گاندھی جی مسلمانوں کے ایک خالص مذہبی مسئلہ خلافت میں تمام تر مسلمانوں کے ہم زبان اور ترجمان بن جائیں! اور برطانیہ سے خواہ مخواہ اس معاملہ میں ٹکرلیں۔

تیسری بار ایک بار پھر گاندھی جی سے یک جائی ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں جب گاندھی جی نے دہلی میں مولانا محمد علی کے مکان پر مقیم ہو کر ۲۱ دن کا برت رکھا ہے، ہندو مسلم اتحاد کے لیے تو اتفاق سے اس زمانے میں میں بھی مولانا محمد علیؒ کا مہمان تھا۔ اور یک جائی دو چار دن تک رہی، اس ہنگامہ خیز ۲۱ روزہ برت کا پس منظر و پیش منظر پوری طرح اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ گاندھی جی کی زندگی کے بعض پہلو بڑے قابل رشک تھے، ہر حال اور ہر موسم میں اُن کا صبح چار بجے اُٹھ پڑنا، اُسی وقت اُن کا ٹھنڈے پانی سے غسل، اُن کی صبح کی عبادت، اور سارے کھانے پینے، لکھنے پڑھنے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے کے معمولات منٹ منٹ کی پابندی سے پورے ہونا، ان کی سادگی اور حیرت انگیز قناعت، بے طمعی، اور بے نفسی غصے پر قابو، کسی حال میں مشتعل نہ ہونا، غریب پروری، سچائی کا دامن اپنے امکان بھر برابر پکڑے رہنا، جفاکشی، اسی طرح کی بیسوں چیزیں اُن میں قابل رشک تھیں اور اُن سے لینے کے قابل۔ اگر اسلام کے اور نمونے اس سے بھی بہتر انھیں مل جاتے اور ایک عرصے تک ملتے رہتے تو عجب نہیں کہ وہ اسلام سے اور زیادہ قریب آجاتے اور اسلام سے ان کی اجنبیت تمام تر رفع ہو جاتی۔ قرآن کے ترجمے جو بہتر سے بہتر ہوئے ہیں، وہ بھی قرآن کا بدل کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتے۔ وہ اشرا اندازی میں اصل قرآن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ چہ جائیکہ وہ انگریزی ترجمے جو انگریزوں کے کیے ہوئے تھے اور جن تک گاندھی جی

کی رسائی محدود تھی! ــــ رہی تاریخِ اُمت تو وہ خلافت راشدہ کے دَورِ صدیقی و دورِ فاروقی کو چھوڑ کر مسلمانوں ہی کے لیے کیا تبلیغی اہمیت و کشش رکھتی ہے، جو ایک پیدائشی غیر مسلم کے لیے رکھتی!

پاکستان قائم ہونے کے بعد وہ ایک عظیم منصوبہ مغربی پاکستان جانے کا بنا چکے تھے کہ اپنے دو چار ہندو مخلصوں، رفیقوں اور شریک کاروں کو لے کر سیکڑوں اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کر کے جائیں گے۔ اِدھر سے وہاں کے بھاگے ہوئے ہندوؤں کو ساتھ لے جا کر دوبارہ پھر آباد کرتے، اور اُدھر سے ہراس زدہ و دہشت زدہ ہندوستانی مسلمانوں کو لے کر واپس آئیں گے۔ آہ، کہ نوشتہ تقدیر کچھ اور ہی تھا!

رشی بھگوان داس

(متوفی ۱۹۵۸ء)

جس زمانے میں مغربی مادیّت و الحاد کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا، (یعنی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک) اور مذہب کی طرف سے انتہائی بدگمانی دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، اس وقت خاص اسلام کی طرف سے تو نہیں، نفس مذہب کی طرف سے صفائی پیش کرنے والی اور اس کے حق میں کلمۂ خیر کہنے والی آوازیں جو کبھی کبھی کان میں پڑجاتی تھیں، اُن میں ایک خوش گوار و لطیف آواز انھیں رشی بھگوان داس کی تھی ——— بنارس کے رہنے والے، ہندو کالج کے استاد فلسفہ، خود بھی ایم۔ اے اور بعد کو پی ایچ ڈی۔ ہندو تصوف میں ڈوبے ہوئے سنسکرت کے فاضل، فارسی میں بھی خاصی دست گاہ رکھنے والے خصوصًا صوفی شاعروں کے کلام میں۔ مسز اینی بیسنٹ کے دست راست نے بڑی اچھی انگریزی میں فلسفہ اور تصوف پر دل نشیں کتابیں اور مقالے لکھنے والے، جن لوگوں کی میں زندگی کے اُس دَور میں عزت و عظمت کرتا تھا، ان میں کم سے کم یہ ایک تو ایسے تھے جو مادیّت کی سطحیت اور کمزوریوں پر زبان کھولتے اور روحانیت کے کچھ فضائل بیان کرجاتے تھے۔

یہ اسلام کے معاند و مخالف تو کیا ہوتے، اس سے بیگانہ و غیر ہمدرد بھی نہ تھے، اور زبان سے بھی کہتے تھے کہ میری ذات جامع ہندومت اور اسلام اور دوسرے بھی بڑے بڑے مذہبوں کی ہے۔ چہرے پر داڑھی شروع ہی سے تھی۔ سِن کے ساتھ برابر لمبی اور گھنی ہی ہوتی چلی گئی۔ دھوتی اس طرح باندھتے کہ عملاً بالکل پاجامے کا کام دیتی۔ پنڈلیاں اس سے ڈھک جاتیں، معلوم ہوتا تھا کہ ایک قسم کی شلوار پہنے ہوئے ہیں۔ مسلمان اہل علم و اہل دل کی خوب صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے۔ اپنے طور پر ذاکر و شاغل اور دھیان گیان کے طریقوں پر

پر عامل بھی تھے۔ اور طرح طرح کی ریاضتیں کئے ہوئے۔ وفات سے کئی سال پیشتر بنارس سے باہر ایک خاموش اور سناٹے کے مقام پر قیام کر لیا تھا۔ ایک مسلمان دوست کا بیان تھا کہ وہاں ایک کمرے میں جانماز اور وضو کے پانی کا بھی انتظام رہتا۔ اور مسلمان آنے والوں کو نماز کی طرف خود ہی توجہ دلا دیتے۔ رسول اللہ کو مطلق افضل البشر تو نہیں لیکن تین عظیم ترین انسانوں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ باقی دو کے نام رام چندر جی اور کرشن جی تھے اور حضرت مسیح اور گوتم بدھ کو نمبر دوم پر رکھتے۔ چہرے پر ایک خاص قسم کی جلا اور چمک پیدا ہو گئی تھی۔ غالبًا شب بیداری کے اثر سے۔ کہتے تھے میرے جی میں آتا ہے کہ ایک مشترک عبادت خانہ بناؤں، جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب اپنے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کیا کریں۔ اخیر میں بڑا زور بنیادی وحدت ادیان پر دیا کرتے تھے اور اس موضوع پر انگریزی میں لکھتے لکھاتے رہتے۔ کہتے تھے کہ فرق مذہبوں کے صرف ظاہری احکام اور فرعی شعائر میں ہے، سیاسی تحریکوں (کانگریس ترک موالات وغیرہ) میں گاندھی جی کے شریک و رفیق تھے، مگر ایک کمزوری پر افسوس بھی کیا کرتے۔ کہتے تھے کہ گاندھی جی کے کام میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جے پکارنے والے تو بے شمار پیدا کر لیے، لیکن اپنے سچے اور مخلص ماننے والے صرف انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل پیدا کر سکے ہیں۔ ہر شہر میں کم سے کم ایک تو گاندھی جی کا سچا چیلا ہونا تھا۔ بغیر اتنی کڑی نگرانی کے کام ٹھیک نہیں چل سکتا ہے — اور تجربے نے بتایا ہے۔ کہ یہ رائے صحیح ون ...

تھی۔ عملاً گاندھوی ہونا اور چیز ہے اور گاندھی جی کی جے کے نعرے لگانا اور۔

قدیم ہندو رشیوں کے جو قصے پڑھنے میں آتے ہیں، بس ان کے وہ نمونے تھے۔ اور ان کو دیکھ لینا ایک ہندو رشی کی زیارت کر لینا تھا۔ شرافت، نرم خوئی، انسانیت، رواداری کے ایک پیکر متحرک تھے۔ وہ زندہ رہتے تو آج کڑھ کڑھ کر جیتے۔ آزاد ہندوستان کے مزاج کو ان کے مزاج سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔

میرے علاوہ خیال ایسا پڑتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی، اور شاعر اصغر گونڈوی سے

بھی اُن سے راہ رسم تھی۔ ان کے لڑکے سری پرکاشس ایم۔ اے (آکسفرڈ) بھی باپ ہی کے نقش قدم پر بڑی حد تک چلے، جواہر لال کے خاص دوستوں میں تھے، پاکستان کے پہلے ہائی کمشنر وہی مقرر ہوئے۔ کراچی جاکر حالات کو بہت سنبھالا ورنہ خدا معلوم کیا کیا نوبت آجاتی۔ آسام کے، مدراس کے، مہاراشٹر کے گورنر رہے، ریٹائر ہوکر دہرہ دون میں گوشہ نشین ہو گئے اور وہیں سے اخباری مضمون لکھ لکھ کر بگڑی سیاست کو گندی اور مسلم بیزار سیاست کو سنبھالنا چاہا، مگر معاملہ ان کے بس سے بالکل باہر ہو چکا تھا۔

دورِ الحاد میں اگر بھگوان داس سے نہ مل لیا ہوتا تو میں خدا معلوم انکار کی کن پستیوں تک جا پہنچتا۔ ہندوؤں کی مشہور دینی کتاب بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ انھیں کا کیا ہوا دیکھا تھا اور اچھا خاصا نفع اس سے حاصل کیا۔ حکمت مطلقہ کن کن لوگوں کو، کن کن موقعوں پر اور کن کن صورتوں سے ذریعہ اور واسطہ ہدایت و رہنمائی کا بنائی رہتی ہے!

حسرت موہانی

(متوفی سنہ ۱۹۵۱ء)

پورا نام سید فضل الحسن، بی اے (علیگ) تھا۔ تخلص نے ایسا دبایا کہ لوگ اصل نام کو بھول ہی گئے۔ وطن قصبۂ موہان ضلع اناؤ۔ انگریزی کے مشہور اہل قلم رائٹ آنریبل سید امیر علی (جج ہائی کورٹ، کلکتہ اور آخر میں پریوی کونسل لندن کے جج) کا وطن اصلاً یہی قصبہ تھا حسرت کے عزیزوں کی بڑی تعداد حیدرآباد میں اور اکثر اونچے عہدوں پر تھی۔ ایک عزیز خواجہ حسن مرحوم بڑے نام ور وکیل تھے۔

علی گڑھ میں اس زمانے میں پڑھا جب عام مسلمانوں میں خیالات علی گڑھ کی طرف سے خراب ہی تھے۔ چہرے کے جمیل اور بشرے کے شکیل کسی معیار سے بھی نہ تھے۔ اور چہرے پر داڑھی طالب علمی کے زمانے میں بھی تھی۔ اور سر پر پٹے رکھے ہوئے اس وقت بھی تھے۔ تواضع وانکسار اور جذبۂ خدمت میں مست و مستغرق۔ ایک چھوٹا سا پاندان ساتھ، لڑکوں میں نام "خالہ جان" غلبۂ شفقت و مادریت کی بنا پر پڑ گیا۔

سخن گوئی اور سخن فہمی دونوں میں اس وقت بھی استاد و مشاق۔ ساتھ ہی سیاسی خیالات میں مسلمانوں کی عام رائے اور جذبات سے بالکل الگ۔ کانگریس میں بھی گرم، یعنی مہاراج تلک کی پارٹی میں شامل۔ انگریزوں سے غیظ و غضب حد عناد تک رکھے ہوئے۔ اور ان سے مقابلے کے لئے ہر اونچی اور نیچی، اچھی اور بری تدبیر کے قائل۔ مذہبی عقیدوں میں حد ضعیف الاعتقادی و وہم پرستی تک پہنچے ہوئے۔ جھاڑ، پھونک، تعویذ اور گنڈے، درگاہی تصوف کے کلمہ گو۔

بی۔ اے کر کے علی گڑھ ہی میں رہنا شروع کیا۔ شغل کے لیے تجارت شروع کر دی

طبیعت میں قناعت بے طمع حد درجہ کی تھی اور اسی درجے کی غیرتمندی اور خودداری۔ اس لیے جو کچھ بھی ملتا اس پر قانع و صابر ہی نہیں شاکر بھی رہتے ــــ شعر و نقد شعر کا ایک رسالہ اردوئے معلیٰ کے نام سے ماہوار نکال لیا۔ کبھی کبھی سیاسی مضمون بھی اس میں خود لکھتے یا دوسروں کے لکھے ہوئے چھاپ دیتے۔ ایک دفعہ اسی طرح کے ایک مضمون پر جیل بھیج دیئے گئے، اور قید بھی قید سخت اور قید تنہائی۔ اس وقت تک کوئی اونچا مسلمان جیل نہیں گیا تھا۔ اور نہ سیاسی قیدیوں کے لیے کوئی خاص درجہ مقرر تھا۔ اس لیے بے چارے کو بڑی سختیوں کا ہدف بننا پڑا۔ ایک شعر میں آپ بیتی بیان کردی ہے ؎

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ذاتی زندگی میں بڑے بے نفس، لیکن سیاسی خیالات میں ویسے ہی کڑے اور متشدد تھے۔ انگریزی حکومت کی مخالفت میں شاید ہر چیز جائز ہی سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ریل پر بے ٹکٹ سفر کرنا۔ خفیہ پولیس کا آدمی جو ہر وقت نگرانی پر تعینات رہتا تھا، اسے ہر طرح غچا دینا جائز سمجھتے۔ سیاسیات میں مقلد گاندھی جی کے آخر تک نہ ہوئے۔ پہلے مہاراشٹر کے تلک مہاراج کے پیرو رہے۔ پھر خود ہی مجتہد بن گئے، جیل گئے، بار بار گئے اور اس وقت جیل جانا شروع کردیا تھا جب گاندھی جی نے اسے آسان اور داخل فیشن نہیں کیا تھا۔ ذاتی زندگی میں سادگی و قناعت کے پیکر مجسم تھے، اور قابل رشک۔ عقائد میں "اہل بدعت" کے ہم نوا تھے۔ یعنی درگاہی و خانقاہی رنگ سے رنگیں۔ عرسوں کے شیدا۔ اخیر عمر میں حج بیت اللہ بھی ہر سال کرنے لگے تھے۔ لوگ پھبتی کستے کہ اللہ میاں کا عرس منانے جا رہے ہیں۔ فرنگی محل میں قادری رزاقی سلسلے میں مرید تھے اور اسی مناسبت سے درگاہ بانسہ (بارہ بنکی) کے بھی بڑے معتقد تھے۔ غزل گو اور شاعر اعلا درجے کے تھے، اور اسی درجے کے نقاد و سخن فہم بھی۔ اپنے لیے شاعری میں راہ مومن و نسیم دہلوی کی اختیار کر رکھی تھی۔ اور خود شاگرد

امیراللہ تسلیم کے تھے۔ زبان کے فاضل بلکہ محقق۔ کئی کئی چھوٹے دیوانوں کے مصنف ہونے کے علاوہ معائب سخن و متروکات وغیرہ پر بھی کئی رسالے لکھے ہیں۔

آخری بیماری بڑی لمبی اور تکلیف دہ پائی۔ علاج کہاں سے کراتے۔ مرشد زادہ جمال میاں صاحب فرنگی محلی نے میڈیکل کالج لکھنؤ کے اسپتال میں بھرتی کرا کے علاج کرایا۔ انتقال فرنگی محل میں ہوا۔ قبر بھی فرنگی محل ہی کے قبرستان واقع باغ ملا انوار (رکاب گنج لکھنؤ) میں بنی، اپنے مرشد کے مزار کے متصل۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ'

ریاض خیرآبادی

(متوفی ۱۹۳۴ء)

سن میں مجھ سے سالہاسال بڑے اور میرے والد کے ملنے والوں میں تھے، لیکن اپنی شفقت و کرم سے مجھے اپنے برابر کا بنا لیا تھا۔ بے تکلف ہر قسم کی گفتگو کرتے اور زبان کے مسائل میں میری ہمت افزائی ہی کرتے رہتے۔

ریاض الاخبار ہفتے میں دو بار میرے بچپن میں گورکھپور سے نکلتا تھا۔ اور اس کم سنی میں زبان کا تھوڑا بہت مذاق جو درست ہوا اس کی درستی میں خاصا بڑا دخل اسی اخبار کو تھا اگرچہ مدتوں اپنی بے شعوری میں اس کا شعور ہی نہ کرسکا۔ اس وقت ریاض کی عین جوانی تھی اور اپنی خوش نمابل کھائی مونچھوں کے ساتھ، مجسم و مکمل جوان رعنا بنے ہوئے تھے۔ رہنے والے قصبہ خیرآباد (ضلع سیتاپور) کے تھے۔ لیکن اب گورکھپور میں رہ پڑے تھے۔ اور عام طور سے گورکھپوری ہی سمجھے جاتے تھے۔ شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اور ریاض کا شمار استادوں میں تھا۔ اپنے میں سمجھ ہی اس وقت کیا تھی۔ بس اتنی سمجھ آگئی تھی کہ یہ شراب کا مضمون باندھنے میں طاق ہیں۔

انگریزی سے ریاض کا اپنایا ہوا اردو ناول دو ضخیم جلدوں میں حرم سرا کے نام سے پڑھ ڈالا اور ان کے جیبی اخبار فتنہ و عطر فتنہ بھی نظر سے گزرنے اور مزہ دینے لگے۔ بی۔اے کرچکا تو ذاتی پینگ بڑھے، اور اب ان کی شاعری بھی دل میں گھر کرنے لگی مراسلت شروع ہوگئی۔ کبھی کبھی میرا دل اور میری عزت بڑھانے کو مجھ سے اس طرح کے سوالات کردیتے کہ "اردو عربی لفظ کے فارسی ترکیب کے ساتھ آپ اردو میں استعمال کی اجازت دیتے ہیں"۔ ـــــ ایک مرتبہ داغ کی ایک غزل کے اس مطلع پر لے دے شروع ہوئی کہ ـــ

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جُدا کرنا
اس سوچ میں بیٹھا ہوں کہ آخر مجھے کیا کرنا

اعتراض دوسرے مصرعہ پر ہوا، کہ محض "کیا کرنا" خلاف محاورہ ہے۔ "ہے" کا اضافہ ضروری تھا۔ ریاض نے بہ کمال تہذیب و شائستگی یوں چھاپا کہ دوسرا مصرعہ میں صحیح نہ پڑھ سکا۔ داغ کا نجی خط ریاض کے نام آیا کہ "اخباری بحث میں تو میں پڑتا نہیں، ہاں آپ کے علم کے لئے لکھتا ہوں کہ دوسرا مصرعہ میرا ہی ہے اور میں نے محاورے کو صحیح باندھا ہے۔" ریاض اپنا جواب مجھ سے نقل کرتے تھے کہ "آپ کی زبان پر بھلا مجھے مجال اعتراض ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہی ہے کہ وہ آپ کی زبان سے بھی۔ اگر وہ آپ کی زبان ہے تو آپ اپنے ہی کلام سے اس کی سند پیش کردیں، مجھے کسی دوسرے کی سند کی حاجت نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ حیدرآباد میں اتنے دن رہتے رہتے محض بے خیالی میں اس طرح نظم کر گئے۔ اگر آپ کی زبان یہی ہوتی، تو اسے کہیں اور بھی تو لاتے۔"

ریاض الاخبار بند ہو جانے پر مشرق بڑے آب اور تاب اور بڑی طمطراق کے ساتھ نکلا۔ اس کے ایڈیٹر صاحب حکیم برہم (عبدالکریم خاں) تھے قصبہ فتحپور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے اور ریاض کے استاد بھائی، یعنی امیر مینائی کے شاگرد۔ یہ بھی مجھ پر ریاض ہی کی طرح مہربان ہو گئے۔ انگریزی حکام سے بڑا ربط رکھتے تھے۔ میری بھی سفارش حکام سے کی۔ اس زمانے میں مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔ یہ بھی اچھے نثر نگار تھے۔ دیوا کے بزرگ حاجی وارث علی شاہ کے عاشقوں میں تھے۔

ریاض کے بڑے قدرداں گورکھپور کے رئیس مولوی سبحان اللہ خاں تھے، ایک مرتبہ ایک مطلع پر خوش ہو کر ایک ہزار کی رقم انعام دے دی (آج کے حساب سے یہ رقم ۱۰، ۱۲ ہزار کی ہوئی) مطلع، اب جہاں تک یاد پڑتا ہے، یہ تھا ؂

اُتری جو آسمان سے تھی کل اُٹھا تو لا
طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اُٹھا تو لا

ریاض آخر عمر میں خیر آباد میں گوشہ نشین ہو گئے۔ راجہ صاحب محمود آباد کے ماں سے کچھ ماہوار پنشن مقرر ہو گئی تھی۔ آخر وقت تک ملتی رہی۔ ان کے ایک بڑے معتقد، ایک اپنے وقت کے بڑے فاضل قاضی تلمذ حسین ایم۔ اے (علیگ) گورکھپوری تھے۔ انھیں نے ان کے بعد وفات کلام بڑی تلاش کے بعد ریاض رضوان کے نام سے شائع کیا۔ عام پڑھنے والوں کا خیال ہو رہا ہو گا کہ بڑے شرابی ہوں گے۔ حالانکہ واقعتاً شراب کے قریب بھی نہیں گئے تھے۔ ساری رندی اور مستی محض لفظ و شعر تک تھی۔ اخیر میں لمبی سفید داڑھی بھی بڑی بہار دکھا رہی تھی۔

ڈاکٹر کیمرنؔ

(متوفی سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد)

کالج میں پڑھنے جب آیا، تو سابقہ سات آٹھ فرنگی اُستادوں سے پڑا، اور یہ سابقہ لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی ملاکر سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۳ء تک رہا۔ اُن میں بُرا اور قابل شکایت شاید کوئی بھی نہ تھا، دو خاص طور پر اچھے اور بڑے شریف نکلے۔ ان میں سے ایک مسٹر اینڈریوز اسٹیفن کالج، دہلی کے پرنسپل تھے۔ اصلاً پادری تھے، اور ہندوستانیوں میں خوب مقبول بلکہ ہردلعزیز۔ قومی ونسلی برتری کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ ہر ہندوستانی سے پورے لطف و مدارات سے پیش آتے۔ گاندھی جی کے بڑے معتقد اور معتمد علیہ تھے، مگر میرا سابقہ ان سے بہت ہی کم رہا۔ مہینوں کا بھی نہیں، کُل چند ہفتوں کا۔ اس لئے میں اُن کا مستقل ذکر ہی ترک کئے دیتا ہوں۔

دوسرے انگریز (بلکہ زیادہ صحیح طور پر) اسکاچ پروفیسر ایم۔ بی کیمرن (Cameron) تھے، کیننگ کالج، لکھنؤ میں جب تھرڈ ایر (بی اے کے پہلے سال میں) آیا تو ان سے دُہرا سابقہ شروع ہوا۔ ایک بہ حیثیت انگریزی ادب کے اُستاد کے، دوسرے بہ حیثیت فلسفہ (نفسیات، اخلاقیات، وغیرہ کے) اُستاد کے۔ نفسیات کا شمار اس وقت تک فلسفہ کے اندر تھا۔ کیمرن صاحب دونوں چیزوں کے بڑے اچھے اُستاد تھے، ماہر فن ہوں یا نہ ہوں، بہرحال معلم دونوں مضمونوں کے بہت ہی اچھے، اور برتاؤ میں معلم سے بھی بہتر۔ انگریزی بُری بھلی جو کچھ بھی لکھنا آئی انھیں کے فیض و شفقت کا ثمرہ تھا۔ ایک تیسرا اور چھوٹا سابقہ یہ بھی شروع سے آخر تک رہا کہ کیننگ کالج لٹریری سوسائٹی کے یہ صدر بھی تھے۔ یہ بحث و مباحثہ انھیں کی صدارت میں ہوتا۔

گھر پر طلبہ سے ملنے جُلنے کا وقت سہ پہر کا رکھا تھا۔ اور تو کوئی جاتا آتا نہ تھا، میں ہی البتہ حاضری وقتاً فوقتاً دے لیا کرتا۔ جب میں جاتا، اُٹھنے کا دل نہ چاہتا۔ باتیں خوب دلچسپ کرتے، کچھ پڑھنے لکھنے کی بھی، اور کچھ عام دلچسپی کی۔ مذہبی آدمی تھے، اور میرے اس وقت کے الحاد کے مقابلے میں ایک پورے واعظ تھے۔ نمونۂ خُلقِ مسیحی۔ فرقہ وارانہ یقین میتھوڈسٹ فرقہ سے رکھتے اور کلیسا میں عبادت کو ہر اتوار کو پابندی سے جاتے رہتے۔ میرے ہی زمانے میں ترقی پاکر کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ مجھ سے بہت خوش رہتے۔ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے استاد نفسیات ڈاکٹر ولیم جیمس (مصنف پرنسپلز آف سائیکلوجی) کے میرے ہی طرح وہ بھی بڑے شیدائی تھے۔ انگریزی ادب کے گھنٹے میں ان انگریزی لفظوں اور ترکیبوں کی ایک فہرست لکھا دیتے، جنکے لکھنے میں ہندوستانی ادیب اکثر غلطیاں کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اُس وقت پوری قدر نہ ہوئی اور فہرست گم ہو کر رہی ورنہ وہ فہرست تو ایسی تھی کہ ساری عمر کام دیتی۔ جب قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں کر چکا، اُس وقت کے بعد سے کئی بار اللہ سے دعا مانگ چکا ہوں کہ کیمرن صاحب کے دل میں اگر شائبۂ ایمان بھی ہو تو اس ناچیز کے ذخیرۂ اجر میں ان کو بھی ضرور شریک کیا جائے۔

لکھنؤ یونیورسٹی انھیں کے زمانے میں قائم ہوئی (غالباً ۱۹۲۰ء میں) اس کے پہلے وائس چانسلر وہی ہوئے۔ اور اسی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی آنریری ڈگری عطا کی۔ تواضع و انکساری میں بالکل مشرقی تھے۔ پنشن کے بعد ولایت چلے گئے، اور وہیں کئی سال بعد رحلت کی۔ غالباً ۱۹۴۰ء کے بعد۔ ایک ہی لڑکا تھا اور شاید انجینیری کی کسی شاخ میں ملازم ہو کر پاکستان آ گیا تھا۔ پوتی نے فنون لطیفہ میں نام پیدا کیا اور کسی ناچنے گانے کے طائفے میں شریک ہو کر ہندوستان آئی۔ دہلی میں قیام کا حال اسٹیٹسمین میں پڑھ کر میں نے اپنے تعارف کا خط لکھا، شکریہ کے ساتھ جواب آیا۔ پھر اس کی شادی ہوئی اور دعوت نامہ میرے پاس بھی اپنے منگیتر کی تصویر کے ساتھ ولایت سے آیا۔

جی میں یہ دعا بھی آئی کہ کاش اس عالم میں ایسے مہربان اُستاد کا ساتھ ممکن ہوتا!

اقبال

(متوفی ۱۹۳۸ء)

اقبال سے واقفیت اس وقت سے ہوئی، جب میں اسکول کے کسی نیچے درجے میں پڑھتا تھا۔ غالباً ۱۹۰۳ء میں۔ اور اقبال اس وقت تک نہ ڈاکٹریٹ سے سرفراز ہوئے تھے اور نہ فلسفے میں شہرت پائے ہوئے تھے، شہرت ان کے نام کو اس وقت بھی اچھی بھلی شاعری میں حاصل ہو چکی تھی، اور حسرت موہانی کے ماہ نامے اردوئے معلّی میں ان کی غزلوں پر کبھی کبھی تنقید چھپا کرتی تھی اور وہ بھی زیادہ تر زبان کے اعتبار و معیار سے۔ ہا، بچپن کا زمانہ بھی کس درجہ جہالت و نادانی کا ہوتا ہے۔ وہ تنقیدیں بڑے شوق سے پڑھ کر یاد کر لیتا تھا۔ اور ناواقفوں کے سامنے بڑے فخر و پندار سے انھیں اپنی جانب منسوب کر کے اقبال پر اعتراض کیا کرتا تھا، گویا میں اتنا بڑا نقّاد و سخن فہم ہوں کہ اقبال تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور اُن کی دھجیاں اُڑا دیتا ہوں!

جب سن اور آیا، اور شعر سمجھنے کی تھوڑی بہت تمیز آچلی (وہ بھی زیادہ مولانا شبلی اور حضرت اکبر الہ آبادی کے فیض صحبت سے) تو اپنی اس طفلانہ عادت پر خود بڑی نفرین کی اور اقبال کا کلام بڑے لطف و عقیدت سے پڑھنے لگا خصوصاً ان کی فارسی مثنویاں۔ اسرار خودی رموز بے خودی۔ اودھ پنچ (لکھنؤ) میں اب بھی اُن پر سخت خردہ گیریاں چھپتی رہیں۔ لیکن اب انھیں خرافات کے درجے میں سمجھنے لگا۔ اقبال کا ترانۂ ملّی

مُسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اب گراموفون میں بھر لیا گیا تھا۔ اور بعض خوش آوازوں کے گلے سے اس کے سُننے کا اتفاق ہونے لگا تھا۔ محمد علی ان نظموں سے بڑے ہی متاثر تھے۔ اور اُن کے تاثر سے حصہ میں بے علم و ذوق بھی پورا لینے لگا تھا ــــ پیام مشرق، بال جبریل، ضرب کلیم، جاوید نامہ، ارمغان حجاز،

ایک کے بعد دوسری شائع ہوتی رہیں۔ ایک ایک چیز شوق سے منگاکر بڑی بے قراری سے پڑھی۔ بعض پر خوب رویا اور بعض پر دل کٹ کر رہ گیا اور کلام میں سب کے علاوہ مثنوی رومی تو اب میرے لئے ایک شمع ہدایت تھی۔ اُس سے کچھ ایسا کم مرتبہ اقبال کی بھی مثنویوں اور نظموں کا نہ رہا ایک دور میرے ادپر کئی سال کا قوالی وسماع کا بھی رہا ہے۔ کلام اقبال کے اچھے خاصے ٹکڑے اپنے قوال کو یاد کرادیے تھے اور جب جی چاہتا، اپنے قوال سے ان کو سُنا کرتا۔

ملاقات ایک بار لکھنؤ میں تو ۱۹۱۲ء میں بالکل سرسری رہی، اقبال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں آئے تھے، اپنے شرمیلے پن سے نہ کچھ آگے بڑھ سکا نہ کچھ زیادہ استفادہ کرسکا۔ پھر شاید ۱۹۲۰ء میں اقبال سے ملاقات حیدرآباد میں ہوئی، وہ مدراس سے اپنے انگریزی لکچر دے کر واپس ہورہے تھے، میرا جانا حسنِ اتفاق سے عین اس وقت حیدرآباد کا ہوگیا۔ ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں، اور اس کے بعد مراسلت کا سلسلہ ان کی وفات کے وقت تک جاری رہا۔ حضرت اکبر کو اقبال نے اپنے خط میں (میرے نشۂ فلسفیت کے زمانے میں) لکھا "کہ آپ کے ماجد صاحب تو برگساں کی جیب میں رہتے ہیں" حضرت اکبر نے جواب دیا کہ "انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب برگساں ماجد صاحب کی جیب میں رہا کرے گا" ـــــ اللہ ان دونوں بزرگوں کے مرتبے بڑھائے، کیسا کیسا اپنے چھوٹوں کو بڑھاتے بلکہ بڑھاتے چڑھاتے تھے۔

اقبال دینی اور اسلامی شاعر شروع ہی سے رہے۔ سن کے ساتھ یہ رنگ پختہ سے پختہ تر شوخ سے شوخ تر ہوتا گیا، بعض نظمیں تو سو فیصدی سوز جگر ہی کی ترجمان ہیں۔ البتہ اقبال کی نثر خصوصاً انگریزی نثر میں، جہاں انھوں نے جدید فلسفے کی شرح و ترجمانی کی ہے وہ اسلامی رنگ سے بار بار ہٹ ہٹ گئے ہیں۔

اقبال میں رندی شروع میں اچھی خاصی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی گئی اور وہ توبہ دانابت کے خوگر ہوتے گئے، پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھے، لیکن طبیعت و مزاج کے لحاظ سے اس کام کے کچھ زیادہ اہل نہ تھے، محمد علی کی طرح یہ بھی ولایت پلٹ ہوکر ٹھیٹھ مسلمان بنے رہے ــ اور

وفاق اسلامی کے قیام کے داعی محمد علی کے بعد شاید سب سے بڑے یہی تھے۔ وطنیت و وطن پرستی کے رد و مذمت میں ان کی متعدد نظمیں یادگار بن گئی ہیں۔ قیام پاکستان ایک بڑی حد تک انھیں کی تخلیق فکر ہی کا نتیجہ تھی۔ مصطفےٰ کمال ترک کے خلع منصب خلافت کو انھوں نے محمد علی ہی کی طرح کبھی معاف نہیں کیا۔

وطن دوستی ایک حد تک تو فطری و طبعی ہے اور اقبال کا ترانۂ وطن ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اسی ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ باقی اس کے آگے وطنیت کو دین بنا لینا اقبال کی شریعت میں "کفر و زندقہ" ہے۔

شبلی نعمانی

(متوفی ۱۹۱۴ء)

قلم سے انگلی پکڑ کر جب چلنا، بلکہ چلنا کیوں کہیے گھسلنا سیکھا اور زبان کو کچھ شُد بُد آگئی تو سب سے پہلا اُستادِ کامل جو نصیب ہوا، وہ مولانا شبلی تھے۔ نام بالکل ہی بچپن سے کان میں پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایک چچا زاد بھائی تھے عبدالحلیم آشر۔ خوب اخبار بین اور بڑے کتب بین دلچسپ اور صاحبِ معلومات۔ وہ بچپن ہی سے اخبارات سُنایا کرتے تھے، انھیں کی زبان سے "علامہ" شبلی کا لفظ بڑے اکرام اور بڑی تعظیم کے ساتھ سُننے میں آچکا تھا۔ جب اسکول کے نویں درجے میں تھا اور سنہ وہ ۱۹۰۵ء تھا۔ لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کی دستار بندی (دستار بندی اب کون سمجھے گا؟ یہ کہیے کہ سالانہ امتحان سے فراغت کے بعد تقسیم اسناد یا کانووکیشن) کا جلسہ شان و شوکت کے ساتھ ہوا، والد ماجد ندوے کے ہواخواہوں اور ہمدردوں میں تھے ان کے ہمراہ سیتاپور سے جلسے میں آیا۔ اتنا پُر رونق و باعظمت جلسہ پہلے کبھی کیوں دیکھا تھا۔ مولانا کی زیارت ہوئی، تقریریں سُنیں، گفتگوئیں سنیں۔ اثر و تاثر بڑھتا چلا گیا۔ چلتے وقت والد صاحب نے دو کتابیں خرید دیں۔ الکلام اور رسائل شبلی۔ انھیں لا کر سیتاپور میں گھوٹنا شروع کیا۔ رسائل تک خیر سمجھ ساتھ دے سکی۔ الکلام اپنی استعداد سے خاصی اونچی نکلی۔ سمجھا یا نہ سمجھا، بہرحال مولانا سے متاثر بلکہ مرعوب پوری طرح ہو کر رہا۔ اور عالم، فاضل، اہل قلم، جتنے بھی اس وقت تک نظر میں تھے، سب نظر سے گر گئے ـــــ عالموں اور فاضلوں کے لئے چلا ہوا لفظ اس وقت تک "مولوی"، استعمال میں تھا۔ بڑے سے بڑے عالم اس وقت تک محض "مولوی" تھے۔ حد ہے کہ مولوی محمد قاسم نانوتوی، محض "مولوی" رشید احمد گنگوہی، صرف "مولوی"، مولوی محمد نعیم

فرنگی محلی، فقط "مولوی"، مولوی عبدالحئی فرنگی محلی، خالی "مولوی" مولوی ثناء اللہ امرتسری خالی خولی "مولوی" اور ہاں کوئی کوئی "مُلّا" بھی مثلاً یہ انوں میں ملا نظام الدین فرنگی محلی، مُلّا جیون امیٹھوی، "مولانا" کا لفظ پہلی بار مولانا شبلی ہی کے ساتھ دیکھا۔ اور دل نے اسے بلا تامل و تردّد قبول کرلیا۔ "مولانا" کیسا "علامہ" کہنا چاہیے تھا اور یہی کہا بھی گیا۔

ان کا ماہنامہ الندوہ پہلے سے گھر میں آرہا تھا، اب اسے اور زیادہ شوق، عقیدت و عظمت کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔ اور مولانا کی ایک ایک کتاب کی تلاش میں ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے۔ جوئندہ یابندہ، چیزیں ملتی ہی گئیں۔ ہائی اسکول (میٹری کولیشن) کا امتحان پاس کر کے جولائی ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ پڑھنے آگیا۔ بھائی صاحب مجھ سے دو سال آگے پہلے ہی سے لکھنؤ میں پڑھ رہے تھے۔ اور کبھی کبھی کے مولانا کے ہاں کے حاضر باشوں میں تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ حاضری دینے لگا۔ بات چیت فرط مرعوبیت سے کیا کرتا۔ یہی بہت تھا کہ آٹھویں دسویں گھنٹہ دو گھنٹہ سہ پہر کے وقت چپ چاپ باتیں سننے کو مل جائیں، گفتگو مختلف، متفرق مسائل پر مجمع بڑا نہ ہوتا بس دو ہی چار آدمی ہوتے، زیادہ تر طالب علم ہی، کبھی ندوے کے، کبھی کہیں اور کے۔ اکثر کوئی تاریخی موضوع چھڑ جاتا۔ ندوے کے ایک ہونہار طالب علم اپنے ہی ضلع کے مولوی عبدالباری (ولد حکیم عبدالخالق) تھے، اُن سے اب دوستی پیدا ہو چکی تھی۔ اکثر وہ بھی ساتھ جاتے۔ ایک طرف یہ سب کچھ تھا، دوسری طرف کالج کے ماحول اور انگریزی کتابوں کے اثر سے مذہبی عقائد بگڑنا شروع ہو چکے تھے، اور اس میں روز افزوں اضافہ تھا۔ بدگمانی ذات رسول ؐ سے شروع ہوئی اور پھر بات بڑھ کر قرآن اور وجود باری تک پہنچی۔ مادیت اور الحاد کا زہر پوری طرح اثر کر چکا تھا۔ اور انجکشن پر انجکشن جب بنیادی عقائد کے حق میں زہر کے لگ چکے تھے، تو جزئیات و فروع کا کیا ذکر۔ مولوی عبدالباری بیچارے اپنی والی بہت کچھ سنبھالتے۔ اور پورا حق دوستی و اخلاص ادا کرتے، لیکن بات ان کے بس سے باہر ہو چکی تھی۔ سب سے بڑھ کر مرحلہ یہ پیش آیا کہ اصل بغاوت کا رخ الکلام کی طرف پھر گیا، وہی اب تک مذہب کا سب سے بڑا قلعہ، دین کا سب سے

سے محفوظ مورچہ تھا، مذہب بیزاری، تشکیک ولاادریت کی زد سب اکبارگی آکے اسی پر پڑی۔ اور دل نے اس کتاب کی تردید کی ٹھان لی۔ اور فارسی کا وہ مشہور شعر مجھ ناہنجار ہی کے حق میں صادق آکر رہا ؎

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد!

لکھنؤ سے نیا ماہ نامہ الناظر نکلنا شروع ہوا تھا۔ اور اس کے ایڈیٹر صاحب کو مولانا شبلی سے دیرینہ بغض تھا۔ الکلام پر تنقید انھوں نے اپنے ماہ نامہ میں قسط وار نکالنا شروع کی تنقید بھی کیسی، سرسری یا لاغر اندام نہیں، لحیم وشحیم، ڈیل ڈول والی، اصل کتاب کے قریب الحجم! سات نمبروں میں آئی۔ وجود باری، رسالت، روح، جزاو سزا، غرض ایمانیات کے سارے بنیادی ابواب میں ایک ایک پر تنقید۔ شبلی دشمن اور دین دشمن ان دونوں حلقوں نے اسے خوب خوب اچھالا اور میری خوب پیٹھ ٹھونکی۔ تنقید اپنے نام سے دینے کی ہمت کسی طرح نہ ہوئی، اصل ڈر تو والد صاحب کا تھا۔ وہ اس لامذہبی سے انتہائی ملول ومغموم ہوتے۔ اور مروت خود مولانا شبلی کی ذات سے رہی، نام اُن پر کھل جاتا، تو پھر اُن کے سامنے جانے کی کسی طرح جرأت نہ ہوتی بہرحال قلمی نقاب "ایک طالب علم" کا اصل چہرے پر چڑھالیا۔ مولوی عبدالباری تو رازداروں میں تھے، باقی کچھ اور لوگوں کو بھی رفتہ رفتہ پتا چل ہی گیا۔ حاضری اس وقت مولانا کے ہاں بہت ہی کم کردی۔ چھ سات مہینے کی طویل مدت میں حاضری بس دو ہی ایک بار رہی! خود مولانا کا خیال مجھ گمنام اور بے نشان کی طرف کیا جاتا، عبدالحق بی۔اے کی طرف گیا، وہی مولانا کے باغی شاگرد جو بعد کو بابائے اردو، کے نام سے مشہور ہوئے۔ راز کب تک چلتا، آخر ایک روز کھلا، اور مولانا کی عالی ظرفی کی گواہی کے لئے یہ کافی ہے کہ مولانا کو ذرا بھی ناگواری نہ ہوئی۔ ناخوش نہیں ہوئے، متحیر ضرور رہے، اور تعلقات گھٹ جانے یا ٹوٹ جانے تو کیا معنی، رفتہ رفتہ پہلے سے کہیں بڑھ گئے۔ یعنی اُن کی طرف سے کرم وشفقت بھی بڑھی اور ادھر سے احترام وعقیدت بھی۔ سا۱۹۱۱ء

سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنے خصوصی مشوروں پر مجھے شریک کرنے لگے۔ خصوصاً ندوے کی اندرونی پیچیدگیوں اور ارکان ندوہ کی باہمی بدمزگیوں میں۔ اور الندوہ میں انگریزی مقالوں سے میرے ترجمہ کئے ہوئے نکلنے لگے ـــــ اس وقت میری انتہائی عزت افزائی کا باعث ماموں ناہی کے طفیل میں ملاقات ابوالکلام سے بھی شروع ہوئی۔ ان کے قیام لکھنؤ کا مستقل زمانہ شاید ۱۹۰۵ء کا تھا کل سات مہینے کے لئے۔ اور اب صرف کبھی کبھی کا گشت وہ لکھنؤ کا لگا لیا کرتے تھے، پہلی ملاقات مولانا ہی کے ہاں ہوئی۔ غالباً ۱۹۰۹ء میں۔ اس وقت بڑے خوبصورت نوجوان تھے۔ اور ایرانی شاہزادے سے لگ رہے تھے۔ ترکی کوٹ اور ایرانی ٹوپی میں ملبوس۔ اُن کی برجستگی، حافظہ، طباعی ہر ایک چیز قابل داد تھی۔

مولانا کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی (شیخ التفسیر) سے بھی اسی زمانے میں نیاز حاصل ہوا، اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالسلام سے تعلقات یگانگت کی حد تک پہنچ گئے۔ اور مولوی مسعود علی ندوی تو خیر اپنے ہی ضلع اور جوار کے تھے ہی۔

مولانا نے جب سنہ ۱۹۱۱ء میں اپنی عظیم کتاب سیرۃ النبی لکھنا شروع کی تو انگریزی معلومات حاصل کرنے کی خدمت مجھ نااہل ہی کے سپرد کی۔ ۵۰ ماہوار کی رقم اس کے لئے مقرر کردی ۵۰ کی رقم کو حقیر نہ سمجھیے آج ۱۹۴۷ء کے کم سے کم ۵۰۰ کے برابر تھی، اس وقت میں بیکار تھا ہی۔ اس پر بھی مولانا کی تاکید یہ رہتی کہ کبھی ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ اس کام کو نہ دینا ـــــ مولانا سے ان کے معاصروں کو اور جو کچھ بھی شکایتیں ہوں لیکن جہاں تک شرافت، آدمیت، حسن اخلاق کا تعلق ہے کم سے کم اپنے معاملے میں تو میرا تجربہ بہت ہی اچھا اور بے داغ ہے۔

بہترین کتاب ان کی بہت ہی ناتمام سیرۃ النبی ہے، ان کے سارے فضل و تحقیق کا نچوڑ۔ کتابیں دیکھنے کے لائق ہیں الفاروق اور پھر المامون وغیرہ۔ ادبی و تنقیدی رنگ میں شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر نمبر اول پر ہیں۔ شعر خوب کہتے تھے۔ خصوصاً فارسی غزل۔ اور عربی کا مذاق اچھا رکھتے تھے، فارسی سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ عربی میں کچھ زیادہ لکھنے کا موقع نہ مل سکا، صرف ایک ہی یادگار

چھوڑی ہے۔

مثنوی صبح امید بہت ہی اچھی کہی ہے گو اس کے متعلق رائے بڑی ہی نامنصفانہ رکھتے تھے تاریخی وتحقیقی مقالے بھی الجزیہ حقوق الذمیین، کتب خانہ اسکندریہ کے نام سے بے مثل لکھ دیے ہیں۔

معاصرت کا ابتلا بڑا ابتلا ہوتا ہے، اکثر کا تقویٰ اس میدان میں آکر جواب دے جاتا ہے شبلی بھی عجب نہیں کہ سرسید کے مقابلے میں معیاری ثابت نہ ہوں۔ لیکن ایسے بھی ہرگز نہیں، جیسے ان کے بعض غالی مخالفوں نے انھیں بدنام کر رکھا ہے۔ مزاج کے ذرا تیز تھے، اور اپنے بعض جذبات میں بھی انتہائی سرے پر تھے۔ میٹھا بہت تیز اور بڑی مقدار میں پسند کرتے تھے، اسی طرح برف بھی ہر موسم میں استعمال کرتے، اور وہ بھی خوب تیز۔ ان طبی بد پرہیزیوں سے بڑا جسمانی نقصان بھی اٹھایا اخیر میں (اور ابھی سن پورے ساٹھ کا بھی کہاں ہوا تھا۔ ۵۵ اور ۶۰ کے درمیان تھے) کہ بیماریوں کا ایک پوٹ بن کر رہ گئے تھے۔

غزل کے شاعر تھے، اور شاعری محض اہل قال نہیں، اہل حال۔ درجۂ تقویٰ کا معیار ہمیشہ اعلیٰ نہیں رہ سکتا تھا، لیکن بعض بے احتیاطیوں اور بے اعتدالیوں کو بہ سلسلۂ قیام بمبئی جس درجے پر غالی مخالفوں نے پہنچا دیا تھا، وہ بھی صاف مثالیں انتہائی مبالغے کی ہیں ــــــ صحیح جسمانی حالت کے لئے تو زکام ہو جانا، زیادہ چھینکیں آجانا بھی برا ہے، لیکن اسے تپ کہنہ یا تپ محرقہ کے درجے پر پہنچا نا اس سے بھی برا ہے۔

سیاسی خیالات میں آزادی پسند شروع ہی سے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص آزادی پسند ہو، وہ قید و بند کی منزلیں طے کرنے اور جیل جانے کے لئے بھی تیار ہو۔ مذہبی پابندیاں بار جس سن تک بھی محسوس ہوئی ہوں، بہرحال جب سے سیرت لکھنے پر آمادہ ہوئے، عملاً بھی نماز وغیرہ کے پابند اسی وقت سے ہو گئے تھے۔ غیرت ایمانی وحمیت دینی کی کمی پہلے بھی نہ تھی۔ آریہ سماجیوں نے جب نیا فتنہ "شدھی" یا ارتداد کا زور شور سے اٹھایا، تو اس کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے والوں میں ایک مولانا بھی تھے، یوں بھی قوم کی فلاح و رفاہ کی ہر تحریک میں پیش پیش رہتے تھے۔

زبان سرسید سے اہل زبان کی صحبت میں رہ کر یوں بھی بڑی نستعلیق ہو گئی تھی۔ پھر حیدر آباد میں داغ کی صحبت نصیب ہوئی۔ اور لکھنؤ کے لمبے قیام میں کبھی میر انیس کے خاندان والوں سے اور کبھی مرزا محمد ہادی رسوا سے پتنگ بڑھتے رہتے اور شام کو چوک میں نثار حسین "پیام یار" والے اور خواجہ عبد الرؤف کی دو دکان پر مدت تک معمول رہا، کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دیتے کہ "آخر پور بیے ہیں" — عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیے رکھتے، بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، لیکن جب کسی سے گھل مل جاتے، تو خوب کھل جاتے۔ مولانا ابو الکلام، خواجہ حسن نظامی، مہدی حسن افادی، اور وحید الدین سلیم (مخالفت سے قبل) سے شاید کوئی بھی بات راز میں نہ رکھتے۔ شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے اپنے اُستاد کو حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیا ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اس میں مبالغہ نہیں الکلام، سیرۃ النبی، الفاروق، الغزالی کتنی کتابوں میں اور کن کن مقالوں اور مضمونوں میں یہاں تک کہ خالص ادبی کتابوں میں دین کی نصرت و دفاع کے کیا کیا پہلو ملحوظ رکھے ہیں، اور ان کے کن کن کلامی پہلوؤں کی رعایت رکھی ہے!

اللہ اعلیٰ مراتب سے سرفراز کرے۔

میر محفوظ علی بدایونی

(متوفی ۱۹۴۳ء)

ابھی کہنا چاہیے کہ جوان ہی تھے۔ نزلہ یا کسی اور سبب سے داڑھی کے بال سن سفید ہو کر رہے، اور باطن کی جو نورانیت تھی، چہرہ اس کا آئینہ دار بن گیا ــــ بدایوں کے رہنے والے۔ شرافت، طاعت و عبادت کا پیکر مجسم تھے۔ زندگی کے جزئیات تک میں بھی شریعت مصطفویؐ کے پابند۔ اور بظاہر پوری طرح دنیا دار۔ پہلی بار جب میں ملا ہوں دفتر روزنامہ ہمدرد دہلی میں۔ تو علی گڑھ کے شوخ نگار اولڈ بوائے سے کہیں بڑھ کر کوئی خانقاہ نشیں درویش نظر آئے۔

علی گڑھ میں مجھ سے سالہا سال سینیر رہ چکے تھے۔ غالباً مولانا شوکت علی وظفر علی خاں کے ہم عصر تھے۔ اور ظفر علی خاں کے خاص دوستوں میں تو آخر تک رہے۔ محمد علیؒ کے پریس اور روزنامے کے مینجر بھی دہلی میں شروع شروع رہے۔ نہایت درجہ ذکی و ذہین اور ادب و انشاء کے فاضل اُستاد۔ افسوس ہے کہ لکھا بہت کم، لیکن جو کچھ بھی لکھا، خوب لکھا۔ ہمدرد کے ظریفانہ کالموں میں حاجی بغلول کے نام سے لکھتے۔ اور سچ یہ ہے کہ اودھ پنچ کی بازاری اور دلآزار ظرافت سے اردو کا دھارا انھیں نے پھیرا۔ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے تھے کہ فالج کے مرض میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ قبر کی جگہ پہلے سے طے کر رکھی تھی، ایک بار جب میرا جانا بدایوں ہوا تھا۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں انھیں کا مہمان ہوا تو جگہ دکھائی بھی تھی ــــ مستقل یاد آخرت کی علامت! بڑے ہی زندہ دل، شگفتہ مزاج، صاف باطن تھے۔ کدورت شاید کسی سے نہ رکھتے۔ قرآن مجید کی تلاوت پابندی کے ساتھ کرتے۔ امکان بھر سمجھ کر پڑھتے۔ اور جہاں تک بن پڑتا اس پر عمل بھی کرتے۔ ۱۹۲۳ء کا دسمبر تھا۔ محمد علی اسی سال صدر کانگریس منتخب ہوئے

تھے۔ ان کے طویل و ضخیم انگریزی خطبۂ صدارت کے ترجمے کے سلسلے میں میری بھی طلبی ہوئی اور محفوظ علی کی بھی۔ دن بھر خوب ہنستے بولتے رہتے۔ رات کو ایک ہی خیمہ کے اندر ہم ٹھہرائے گئے۔ پچھلی رات میں میری آنکھ کھلی کیا دیکھتا ہوں کہ محفوظ علی بڑے دبے پاؤں تہجد کے لئے اُٹھے، پوری کوشش کی کہ مجھے خبر نہ ہونے پائے۔ پھر فجر کی نماز کے لئے پہلے دن جامعہ کی برائے نام مسجد، اور دوسرے دن کالج کی دُور دراز مسجد میں موجود! ایسے مخلص افراد اگر کثرت سے ہوتے تو آج امت کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا!

دو انمول ہیرے

(متوفی (۱) سنہ ۱۹۶۹ء (۲) سنہ ۱۹۷۶ء)

ملت اب بھی باکمال مخلصوں سے خالی نہیں، خدا معلوم کیسے کیسے کمالات والے اور کس درجہ دردمندی و اخلاص والے ابھی چند سال قبل تک موجود تھے۔ عین اس وقت بھی موجود ہیں۔ بہتوں کا ذکر اس کتاب میں ضمناً آگیا ہے، اکثر کو اللہ نے شہرت و ناموری بھی عطا کی، اور ان کی یہ حیثیت معروف و مُسلّم ہوگئی، جیسے مولانا محمد علی جوہر یا حسرت موہانی۔ لیکن کچھ ایسے بھی گزرے ہیں، جن کی شہرت اتنی عام نہیں ہوئی، ایک مخصوص دائرے کے اندر ہی محدود رہی —— چنانچہ اس عنوان کے نیچے، ایسی دو ہستیوں کا ذکر ہے۔

(۱) ایک ان میں گزر چکے (۱۹۶۹ء میں) یہ پانی پت کے مولوی لقاء اللہ عثمانی تھے۔ اخلاص کے پیکر اور دردمندی کے پتلے، عالم و عابد و مرتاض، دہلی شہر کی خلافت کمیٹی کے پرجوش و سرگرم ساعی و داعی رہے۔ پھر حیدرآباد چلے گئے، اور مولانا شوکت علی کے زیر نگرانی شبینہ مدرسے چلاتے رہے۔ خلافت کے کام سے جب دوسرے لوگ اُکتا گئے اور اکثروں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ برابر اس سے لپٹے رہے۔

۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں بڑے پیمانہ پر خلافت کانفرنس ہوئی۔ اس میں دیکھا کہ خدمت گزاری میں انھوں نے ریکارڈ قائم کردیا اور خدمت گاروں کی طرح دوڑ دوڑ کر ادنیٰ سے ادنیٰ کام مہمانوں کا خود ہی کرتے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی اور جوار دہلی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی، تو وہ سب وطن چھوڑنے پر مجبور ہوگئے، مگر ایک اس عثمانی شیخ نے کسی قیمت پر بھی پانی پت چھوڑنا گوارا نہ کیا ہر طرف سے باغیوں، طاغیوں سے دشمنوں میں گھرا ہوا ایک یہی مرد مسلمان اپنے وطن میں اٹل

بنا رہا۔ ۱۹۴۸ء کے شروع میں ہندوستان کی قیامت صغریٰ کے بعد گاندھی جی نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اپنے مخصوص چیلوں، اور مسلمان رفیقوں کو ساتھ لے کر پاکستان جائیں گے اور اسپیشل ٹرینوں میں بھر بھر کر ادھر سے بھاگے ہوئے ہندوؤں کو وہاں لے جائیں گے اور ادھر سے حواس باختہ مسلمانوں کو ہندوستان واپس لائیں گے تو اپنے اُن مخصوص مسلمان رفیقوں میں ایک نام انھوں نے اس مرد مجاہد کا بھی رکھا تھا۔ مگر اللہ نے اس کا موقع سرے سے نہ آنے دیا۔ شروع ۱۹۶۹ء میں جب میری محبوب بیوی دفعتاً دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں، جن چند مخلصوں کے تعزیت ناموں سے مجھے واقعی تسلی ہوئی، ان میں ایک یہ بھی تھے۔ مجھے خط لکھا کہ "آپ مرحومہ کا نام مجھے لکھ بھیجیے میں نام کے ساتھ ان کے حق میں پابندی کے ساتھ دعائے خیر کرتا رہوں گا۔" اور قبل اس کے میں نام بھیج سکوں، خود ہی اُس عالم میں پہنچ گئے۔!

(۲) دوسرے صاحب ابھی اپریل ۱۹۷۴ء ماشاءاللہ زندہ سلامت ہیں۔ اللہ اُمت کی خدمت کے لئے مدتوں انہیں زندہ وسلامت رکھے۔ وہ ہیں روزنامہ الجمعیۃ، دہلی کے چیف ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط! امت کی فلاح و اصلاح، خیر خواہی اور خدمت گزاری کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف رکھنے والے اور ملّی و قومی مسائل میں گہری نظر، پوری سوجھ بوجھ رکھنے والے۔ ایثار، دردمندی اور کامل سوزدل کے ساتھ صلاح ومشورہ دینے والے، عقلی اور عملی ہر اعتبار سے صراط مستقیم دکھانے والے۔

ان کے مقالے الجمعیۃ میں پڑھ پڑھ کر مثنوی رومی کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے ؎

در جگر افتادہ ہستم صد شرر
در مقالاتم بہ بیں خونِ جگر

(اصل شعر میں "مقالاتم" کے بجائے "مناجاتم" ہے)

اگر اپنا بس چلتا تو اُمت کا محتسب اعلےٰ کچھ دنوں کے لئے انھیں کو مقرر کر دیتا۔ مخالفین اور معاندین پر بڑی گہری گرفتیں کرتے رہتے ہیں، اور تعمیری حیثیت سے بڑی ہی متوازن اور صائب رائیں

رکھتے ہیں۔ ان کے دو ایک خط جو میرے پاس محفوظ ہیں اور جن میں صدق کی داد و تحسین میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ وصیت اس کی کر جاؤں کہ میرے کفن میں انھیں رکھ دیا جائے۔ (جیسے خوش عقیدہ گروہوں میں پیروں مرشدوں وغیرہ کے شجرے رکھ دیے جاتے ہیں) کہ یہ بہترین سرٹیفکیٹ وہاں کام آنے والا ہو سکتا ہے۔

وجداناً جن چند زندہ ہستیوں کو جنتی سمجھتا ہوں ان میں ایک یہ بھی ہیں۔ صحابہ کے عشرۂ مبشرہ تو رسول ؐ کے وعدہ کیے ہوئے اور بتلائے ہوئے ہیں، یہ اُمت کے ظن و فہم کے مطابق ہیں۔ انشاء اللہ بندوں کا حُسنِ ظن بھی باطل ثابت نہ ہوگا۔

عین ان سطروں کی تسوید کے وقت (مارچ ۱۹۷۳ء میں) اطلاع آئی کہ مولانا الجمعیۃ کی ادارت سے ریٹائر ہو گئے۔[1]

---

[1] مولانا فارقلیط ۱۹۷۶ء میں وفات پا گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعُون۔

بھائی صاحب

(متوفی سنہ ۱۹۶۰ء)

سگے بھائی ایک ہی تھے۔ مجھ سے سن میں ۸ سال بڑے، لیکن اتنے بے تکلف اور ایسے گھلے ملے کہ جیسے دو ہی تین سال کی چھوٹائی بڑائی ہو۔

نام عبد المجیب۔ بچپن ہی سے ضیق النفس کے مریض کہا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ خاندان دمے کے مریض کا کھایا ہوا تربوز کھالیا تھا، بس جب سے یہ مرض لاحق ہو گیا۔ علاج شفیق باپ نے دنیا بھر کا کر ڈالا۔ سن کے ساتھ مرض بڑھتا ہی گیا۔ دورہ پڑتا تو تکلیف دیکھنے والوں سے دیکھی نہ جاتی۔ برسوں تک ایک مرض خناق کا بھی رہا۔ وہ ضیق سے بڑھ کر جان لیوا۔ خیر ادھیڑ سن میں تو خناق سے نجات ہو گئی تھی —— اس صحت کے ساتھ لکھنے پڑھنے بھلا کیا۔ یہی غنیمت ہے کہ انٹرمیجیٹ تک پڑھ گئے تھے، یہ ایف اے کا درجہ بھی اس وقت بی، اے سے کچھ ہی کم تھا۔ بہر حال نائب تحصیل داری میں نامزد ہو گئے۔ اور والد مرحوم کے بعد ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹری تک پہنچ گئے۔ لکھنؤ کی سٹی مجسٹریٹی سے پنشن پائی۔

تحصیل دار اور ڈپٹی کلکٹر مختلف ضلعوں میں رہے، ضلع الہ آباد، ضلع جالون، ضلع لکھنؤ، ضلع رائے بریلی، پھر شہروں میں گونڈہ، بستی، پرتاب گڑھ، سیتاپور، بہرائچ، فیض آباد، سہارنپور اور آخر میں پھر لکھنؤ۔ جہاں بھی رہے نیک نامی سے رہے۔ اپنے افسروں میں بھی، اور عوام میں بھی، حاکمانہ شان، رعب داب سے کورے تھے، سب سے جھک کر ملتے، کنبے والوں، بستی والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہتے۔ پنشن کے وقت شائد ایک ہزار ماہوار کے گریڈ میں تھے اور پھر سستا زمانہ، کھایا کم، کھلایا زیادہ، عزیزوں کی پرورش ہر وقت مدنظر، میری تنگ دستی کے زمانے میں

(اور وہ زمانہ بھی بڑا طویل گزرا ہے) میری مدد تو مستقل طور پر کرتے رہے، اور مجھے اس درجہ عزیز رکھتے کہ اپنی اولاد تک کو یہ درجہ نہ دیتے۔ جس سے میں خفا ہوتا اُس سے کئی درجہ زائد وہ خود خفا ہو جاتے۔

لباس زیادہ تر انگریزی ہی رہتا، لیکن اور عام عادات و اطوار میں ٹھیٹھ مشرقی اور دیسی رہے، پڑھنے لکھنے کا ذوق اچھا خاصا رکھتے، اخبار و رسالے کثرت سے پڑھتے، خرید کر بھی، اور مانگ کر بھی۔ اہل علم کی صحبت کے بھی حریص تھے۔ مولانا شبلی کے ہاں حاضر باشی میں نے انھیں سے سیکھی۔ محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ کے جلسوں میں وہ چھپ چھپ کر ضرور پہنچ جاتے مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا سید سلیمان، مولانا مناظر احسن گیلانی، سید جالب دہلوی، اور دوسرے فرنگی محلی حضرات بلکہ لکھنؤ کے اطباء سے خصوصی تعلقات رکھتے۔ سہارن پور کے چند سالہ قیام میں حضرت تھانوی، مولانا حسین احمد، شیخ الہند مولانا زکریا صاحب کے دلوں میں اپنی جگہ پیدا کر لی تھی۔

گھر میں میل جول کا بڑا اہتمام رکھتے۔ اور یہ بڑی حد تک ان ہی کی نیک نیتی کا اثر تھا، کہ ان کی زندگی بھر گھر میں کوئی نزاع نہیں پیدا ہونے پائی۔ میں نے نکاح ثانی ایک صاحب اولاد اور ۲۸ سالہ بیوہ سے ۴۸ سال کی عمر میں کر لیا تھا۔ بھائی صاحب اگرچہ میرے ہم رائے بالکل نہ تھے، بلکہ عقد کو سرتاسر بے جا ہی سمجھا کیے۔ اس پر بھی، اس معصوم سے واقعہ سے خاصی شورش جو اپنوں اور بیگانوں میں پیدا ہوئی، اُس میں میری طرف سے برابر دفاع کرتے رہے۔

اپنے بڑے لڑکے کو، جو ہر طرح ہونہار تھا، اور جس کے متعلق خیال یہی تھا کہ آئی سی ایس وغیرہ میں داخل ہو کر کسی بڑے عہدے مامور ہو جائے گا، میرے ہی کہنے پر اور سب کی رائے کے خلاف حفظ قرآن میں لگا دیا اور پھر طب پڑھوا دی، یہ بڑا ایثار تھا، اور ان شاء اللہ اس کا پورا اجر اُن مرحوم کو مل کر رہے گا۔ خود بھی نماز و تلاوت قرآن کے پابند تھے۔

اپنی تشکیک و الحاد کے دور میں (اپنی کالجی طالب علمی کے زمانے میں) میرا یہ معمول تھا کہ مغربی ملحدوں کی کتابیں پڑھ پڑھ کر ان کے قول بڑے فخر و پندار کے ساتھ اپنے والوں کے سامنے بیان

کیا کرتا، کہ جیسے مذہب لاجواب ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک دن کسی بڑے جرمن سائنٹسٹ اور ڈاکٹر نام غالباً (HEBRUHOTZ) کا یہ قول نظر سے گزرا کہ انسانی آنکھ کی بناوٹ بڑی ناقص قسم کی ہے، کوئی انسانی ماہر چشم بناتا تو اس کے لئے شرمناک ہوتی۔ اسے حسب معمول اپنے والوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ دیکھیے خدا کی حکمت و صناعی کا بڑا دعویٰ کیا جاتا ہے فلاں جرمن ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ انسانی آنکھ کی بناوٹ اتنی ناقص ہے کہ ایک انسانی ماہر چشم تو اسے اپنے لئے باعث شرم سمجھے گا میری اس بکواس سے لوگ تو کچھ جز بز ہو کر، کچھ خفا ہو کر، کچھ مرعوب ہو کر چپ ہو گئے۔ بھائی صاحب عام طور پر مجھے بڑھاوا دیتے رہتے تھے، مگر یہ سن کر چپکے سے بس اتنا بولے "اچھا تو پھر ان ڈاکٹر صاحب نے کوئی بہتر آنکھ بنا کر دکھا دی؟" عجب نہیں کہ مولائے کریم کے ہاں مرحوم کی نجات اسی ایک فقرے پر ہو جائے۔

اخیر دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں جب دفعتاً انتقال ہوا ہے، تو معلوم ہوا کہ زمین پیر کے نیچے سے سرک گئی! مدتوں اثر ذاتی اور خانگی زندگی پر گہرا رہا۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔ اگر مالی فکر سے وہ بے نیاز نہ کئے رہتے تو شروع شروع خدمت قرآن پر جمے رہنا میرے لئے دشوار ہی تھا۔

ڈپٹی افتخار حسین

(متوفی ۱۹۲۶ء)

نام سید افتخار حسین، سادات قصبۂ کاکوری میں سے تھے، غالباً ۱۹۰۴ء میں سیتاپور میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر آئے، اور ہم لوگوں کی کوٹھی کے بالکل سامنے سول لائنز میں بنگلہ لیا۔ والد مرحوم ڈپٹی کلکٹری سے ابھی نہیں ریٹائر ہوئے تھے۔ اُن سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔

کوئنس کالج، بنارس کے گریجوٹ تھے، یہ کالج اس وقت خاص طور پر نامور تھا۔ ڈگری بی اے کی تھی اور یہ اس وقت عموماً آخری ڈگری تھی۔ لیکن استعداد عام گریجویٹوں اور ڈپٹیوں سے کہیں زائد رکھتے تھے، اردو میں منتہی، فارسی میں صاحب نظر، عربی کی بھی شدبُد رکھتے۔ اور ذوق اور مطالعہ دونوں شروع سے رکھنے والے معاصر شاعروں اور اُستادوں میں حضرت اکبر سے خصوصی تعلقات رکھتے، انگریزی قابلیت اس سے بھی بڑھی ہوئی۔ انگریزی ادبیات کا خوب مطالعہ کئے ہوئے تھے معلوم یہ ہوتا کہ آکسفورڈ یا کیمبرج کے طالب علم رہ چکے ہیں، آخر میں اودھ چیف کورٹ کے رجسٹرار ہو گئے تھے۔ بعد پنشن کے کچھ روز راجہ صاحب محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری رہے، پھر آخر میں جے پور جاکر اس کی چھوٹی سی ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ اُسی زمانے میں لکھنؤ آئے اور یہیں انتقال ہو گیا

مذہبی بھی اچھے خاصے تھے، ساتھ ہی نازک مزاج ونفاست پسند۔ دن میں نمازیں اکثر قضا کرتے، رات کو عشا کے ساتھ ساری نمازوں کا کفارہ کر ڈالتے۔ اور دعا خضوع وخشوع سے مانگتے۔ تصوف کا بھی اچھا خاصا ذوق رکھتے۔ ایک کتابچہ انگریزی میں دیوے کے حاجی وارث علی شاہ رح پر لکھا ہے۔ GOD IN MAN کے نام سے۔

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں بھائی صاحب پر بھی بہت مہربان رہے۔ بھائی صاحب تحصیلدار تھے۔

اور یوں اُن کے اوپر حاکم تحصیل۔ مجھ پر بھی عنایتیں جاری رکھنا چاہیں۔ لیکن میں اس سن میں اپنی نوعمری کی بددماغی سے اُن کے فیض سے محروم رہا۔ اس کی شرمندگی آج تک ہے۔ اور دعا ہے کہ حشر میں جب موصوف کا سامنا ہو، تو ان سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ میرے ہر طرح بڑے تھے، میں نے کبھی انھیں اپنا بزرگ نہ سمجھا۔

سیّد عشرت حسین

(متوفی ۱۹۲۵ء)

نامور باپ، اکبر الہ آبادی کے یہ نسبتاً گمنام فرزند تھے، اور آخر میں یہی اکیلے فرزند حضرت اکبر کے رہ گئے تھے۔ شیعہ بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اکبر صاحب کسی اچھے عہدے پر پہنچ چکے تھے، تو میاں عشرت کا نکاح چٹ پٹ کر کے انھیں ولایت بھیج دیا کہ نکاح کے بعد شاید یہ وہاں کی اخلاقی وباؤں سے کچھ بچے رہیں گے۔ یہ خیال خام ثابت ہوا، اور نکاح کا محض نام کچھ بھی کام نہ آیا۔ وہاں کے رنگ و بو میں ایسے پڑے کہ آئی سی، ایس تو خیر کیا ہوتے بیرسٹری بھی پاس نہ کر سکے۔ غنیمت یہ ہوا کہ کیمبرج سے معمولی گریجویٹ کی سند مل گئی۔

حضرت اکبر کو اس کا بہت ہی رنج رہا کیا۔ ولایت سے قرض دینے والوں کے بل بار بار اکبر کے پاس آتے رہے اور اکبر انھیں ادا کرتے رہے۔ کلیات اکبر میں متعدد نظموں میں اسی جانب اشارہ ہے۔ مثلاً ؎

الا یا ایہا العشرت بترس از کثرتِ بلہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

ایک قطعہ دردناک بھی ہے، دو ایک شعر زبانی یاد رہ گئے ہیں حاضر ہیں ؎

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے — کیا، کو جلکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی — چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیسا کیسا دل نازک کو ستایا تم نے — خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے

جب ہندوستان واپس آئے تو کچھ تو باپ کا اثر و رسوخ، اور کچھ کیمبرج کی ڈگری کا رعب، آتے ہی ڈپٹی کلکٹری

مل گئی۔ کچھ روز بعد سیتاپور تعیناتی ہوئی۔ اس کا ذکر حضرت اکبر کے تذکرے کے ضمن میں آچکا ہے۔

شروع شروع میں بالکل "صاحب" قسم کے تھے، عقیدہ و خیال میں نہیں، عمل و ثقافت میں عقائد بحمد اللہ اس زمانے میں بھی سالم و محفوظ رہے، مجھ سے چند ہی سال بڑے تھے، میرا دل ان سے خوب کھل گیا تھا، اور یہ بھی مجھ سے دل کھول کر بات چیت کرتے۔ اپنے لئے کہہ چکا ہوں کہ میرا وہ دَور الحاد و تشکیک کا تھا، فرنگی فلاسفہ کے سلسلے میں خوب خوش گپیاں رہا کرتیں۔ لیکن آخر اکبرزادے تھے، محض خوش گپی تک نہ رہتے، اپنی والی کچھ نہ کچھ کوشش میری اصلاح کی بھی کرتے رہے۔

ع "مے خانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے"

کی تصدیق ایک بار اور ہو گئی۔

طبیعت کے بڑے بھولے اور نیک تھے، صاحبیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور مشرقیت آتی گئی۔ پرتاب گڑھ، لکھیم پور وغیرہ مختلف شہروں میں ڈپٹی کی حیثیت سے رہے، ایک بار پرتاب گڑھ میں ان کا مہمان رہا، اور کم سے کم ایک بار الہ آباد میں بھی۔ آخر میں پنشن لی اور پنشن کے کچھ ہی روز بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا عبدُ البار ی
فرنگی محلی

(متوفی ۱۹۲۶ء)

علی برادران کے مرشد، خود بھی اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم شریعت، ایک سرگرم ملکی لیڈر، گاندھی جی کے دوست اور معتمد علیہ، بڑے تشکیل و وجیہہ، بڑے ہی فیاض، مہمان نواز لطیف المزاج شروع ہی سے بڑے ہونہار تھے۔ تعلیم کچھ اپنے خاندان فرنگی محل میں پائی اور کچھ حجاز میں۔ کم سنی ہی میں وہاں بھیج دیئے گئے تھے۔ میں نے تو جب پہلی بار دیکھا، اُس وقت یہ پڑھ لکھ کر فاضل ہو چکے تھے، اور ناموری حاصل کرنے لگے تھے۔ میں کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا، خاندانی تعلقات ان سے کئی پشتوں سے تھے، گو اسی خاندان کی ایک دوسری شاخ سے بہت زائد تھے، میں الحاد کے لئے بدنام ہو چلا تھا۔ اور کچھ شرمیلا پن طبعی بھی تھا۔ جب پہلی بار ملا تو کچھ زیادہ آگے نہ بڑھا۔ ایک عزیز قریب اور بے تکلف تھے ممتاز میاں صاحب بانسوی۔ ان کے ذریعہ سے ملاقاتیں زیادہ ہوتی رہیں اور ارتباط بڑھتا رہا۔

۱۹۱۱ء سے یہ خاندان فرنگی محل کی عام روش کے خلاف، سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے لگے اور کانگریس کے قریب ہوتے گئے۔

۱۹۱۴ء میں علی برادران اور شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹر (گدیہ والے) کے مشورے سے انجمن خدام کعبہ بنا ڈالی۔ اور سیاسیاتِ ملکی اور سیاسیاتِ ملّی دونوں میں پیش قدمیاں کرتے رہے، مُریدین کا حلقہ علاوہ اودھ کے حیدر آباد دکن میں بھی وسیع اور متعدد عمائد دکن سے سلسلہ بیعت سے

وابستہ اور جب سے غالباً ۱۹۱۱ء میں علی برادران کو خود بلاکر اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا، مریدوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا۔ سلسلہ قادریہ کے مشہور پیروں میں تھے۔ علاوہ دوسرے اذکار و اشغال کے صبح بعد نماز فجر اشراق کے وقت تک اپنے معمولات میں مشغول رہتے۔ اور کچھ کھاتے پیتے نہ کسی سے بات کرتے۔ اس کے بعد ناشتہ کرتے اور ناشتے میں ہر آنے جانے والے کو شریک فرماتے۔ ناشتے میں لکھنؤ کی شیرمال اور اعلیٰ درجے کی کشمیری چائے ہوتی۔ کچھ لوگ تو اسی طمع میں اکثر حاضری دینے لگے۔ فیاضی اور مہمان نوازی میں اپنی نظیر آپ ہوئے ——— فقہی اور بعض کلامی مسائل میں حضرت تھانوی سے اختلاف تھا۔ مسئلہ سماع میں انھوں نے حضرت تھانوی کا رد بھی کیا ہے۔ مگر حضرت تھانوی خود فرماتے تھے کہ بڑے مہذب، شائستہ آدمی ہیں۔ مرطالعہ بھی وسیع رکھتے مطبوعات مصر و شام و حجاز پر نظر رکھتے۔ اور دین کی بڑی ہی غیرت رکھتے۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل (ملا نظام الدین والا) از سر نو قائم کیا، اور اسے خوب ترقی دی۔ بیسوں، پچاسوں، اچھے اچھے عالم اس سے پیدا کر دیے۔ دین پر حملہ کسی طرف سے بھی ہوتا، یہ بپھر جاتے! تکفیر میں عجلت نہ کرتے، میرے متعلق ۱۹۱۸ء میں بڑا غوغائے تکفیر برپا ہوا۔ کتاب فلسفۂ اجتماع واقعی دارو گیر کے قابل تھی، مگر یہ اپنے مسلک حزم و احتیاط پر قائم رہے اور یہ لکھ دیا کہ تکفیر کے لئے شہادت قطعی ہونا چاہیے۔

۱۹۱۹ء میں جب خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو گویا وہ ترقی یافتہ شکل خدام کعبہ ہی کی تھی، اس میں پیش پیش رہے۔ پھر جمعیۃ العلمائے ہند بنی، وہ بھی گویا انھیں کی بتوائی ہوئی ہے۔ گو کچھ روز بعد اس سے علاحدہ ہو گئے یا علاحدہ کر دیے گئے۔ کہ گویا ان کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ تقریریں بڑی جوشیلی کرتے اور بعض دفعہ دفور جذبات سے بالکل بے قابو ہو جاتے۔ صاحب سماع تھے، خاندانی عرسوں میں سماع سنتے، گریہ بہ شدت طاری ہوتا اور اسی حال میں پگڑی، پیراہن، سب قوالوں کو دے دیتے، بڑے شائستہ، مہذب، نستعلیق تھے۔ مولانا تھانوی سے مسلک میں خاصا اختلاف رکھتے، باوجود اس کے ان کے ادب و احترام میں زرا فرق نہ آنے دیتے، یہی حال علمائے دیوبند وغیرہ کے ساتھ تھا۔ لکھنؤ کا ایک زمانے میں مشہور روزنامہ ہمدم گویا انھیں کا تھا اس معنی میں کہ اس کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی

انھیں کے مُرید ہو گئے تھے، اور ان کے ہاں کے حاضر باشوں میں تھے۔

۱۹۲۵ء میں جب مدینہ منورہ پر سلطان ابن سعود کی گولہ باری کی خبر آئی، تو بہت سے مسلمان فرطِ عقیدت سے بے تاب ہو گئے، اور اسے برداشت نہ کر سکے۔ مولانا محمد علی دہلی سے ٹیلیفون پر کہتے اور لکھتے رہے کہ خبر کے یقین کرنے میں جلدی نہ کیجیے، فلسطین سے مفتی امین الحسینی کو ٹرنک کال کر کے تحقیق کر لیجیے، لیکن کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا۔ معاملہ برابر بگڑتا گیا، اور ہندوستان دو مختلف گروہوں شریفی اور سعودی میں تقسیم ہو گیا۔ اور سخت تصادم شروع ہو گیا۔ ایک پارٹی کے لیڈر مولانا محمد علی تھے۔ دوسرے کے رہنما ان کے مرشد، مولانا عبد الباری! فروری ۱۹۲۶ء (رجب ۱۳۴۵ھ) میں اجمیر کے سالانہ عرس کے موقع پر شریفی پارٹی کی طرف سے جلسے کی بڑی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں اور مولاناؒ وہاں کے سفر کے لیے پوری طرح لیس ہو چکے تھے۔ سامان بندھ چکا تھا اور اسٹیشن کے لیے روانگی ہونے ہی کو تھی، کہ بالکل یک بیک فالج کا اثر معلوم ہوا۔ طبی تشخیص جو کچھ بھی ہو، ہم عامیوں کو تو قلب کا دورہ معلوم ہوا۔ مولانا معًا بیہوش ہو گئے۔ اور بہترین علاج و تیمارداری کے باوجود تیسرے دن دنیا سے رخصت ہو گئے ـــــ جو نہ ہونا تھا ہو کر رہا۔ سِن ابھی کہنا چاہیے جوانی ہی کا تھا، اور قویٰ تو جوان سے بڑھ کر تھے۔ ملّت کی کتنی آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔

گاندھی جی جب اپنی شہرت کے شباب میں لکھنؤ آئے، تو انھیں کے ہاں ٹھہرے۔ ایک اپنے اوسط درجے کے مکان کے علاوہ دوسرا وسیع مکان محل سرا کے نام سے معزز مہمانوں ہی کے لیے وقف تھا، نام بجائے محل سرا کے مہمان سرا ہونا تھا۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ہوتا کہ مہمانوں سے ناغہ ہوتا۔ آج فلاں پیر صاحب بغداد سے آ رہے ہیں، اور کل فلاں عالم صاحب بمبئی سے، حجاز سے، مصر سے، کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا، لکھنؤ میں دو چار جو مشہور مہمان خانے تھے۔ ان میں سے ایک اہم مہمان خانہ مولانا عبد الباری کا تھا۔

میں نے مولانا محمد علی جوہر کی ہمدردی اور مدافعت میں ان کے اِن پیر و مرشد سے طرح طرح کی

گستاخیاں شریفی سعودی مناقشے کے سلسلے میں جو کیں، مدت سے ان پہ نادم و مستغفر ہوں۔ اللہ معاف فرمائے۔ اور مولانا بھی عالم برزخ میں مجھے معاف فرمائیں۔

مولانا کا تذکرہ ناتمام رہ جائے گا اگر ان کے ہاں کی لاجواب کشمیری چائے کا ذکر نہ ہو۔ وہ اپنے ذائقے کے لحاظ سے نہ صرف لکھنؤ کا بے نظیر تحفہ تھی، بلکہ جس سیر چشمی اور افراط سے وہ اہل بزم کی خدمت میں پیش کی جاتی اس کے لحاظ سے تو مولانا کی ایک کرامت ہی تھی۔

بوڑھا کنوارا

(متوفی ۱۹۶۱ء)

نام عبد الحق، لقب بابائے اُردو۔ وطن ہاپڑ ضلع میرٹھ۔ عمر کا بیشتر حصہ دلی میں گزرا ۸۰ اور ۹۰ کے درمیان عمر پائی۔ کتابیں خود کم لکھیں، دوسروں سے لکھوائیں زیادہ۔ دیباچے اور مقدمے اس کثرت سے لکھے کہ لوگوں نے "مقدمہ باز" کی پھبتی جمادی۔ سہ ماہی رسالہ اردو اس شان و مرتبت کا نکالا، کہ اس سے پہلے کیا معنی اس کے بعد بھی ویسا نہ نکل سکا۔ اردو قواعد لکھی اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے پہلے ایڈیشن میں اردو پر ایک قابل دید مقالہ انگریزی میں لکھا۔ اور اخیر عمر میں لغت کبیر کے نام سے اردو لغت اتنی فاضلانہ اور مفصل لکھی کہ فرد واحد سے اس کمیت اور اس کیفیت کی کتاب کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کے سہ ماہی اردو میں اس کی قسطیں نکل رہی ہیں۔

علی گڑھ سے بی، اے کیا۔ ضعیفی میں الہ آباد یونیورسٹی نے آنریری ڈگری ڈی، ایچ، ڈی، کی عطا کی۔ اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی نے آنریری ڈگری ڈی لٹ کی دی۔ یہ شروع سے "مملکت آصفیہ" کے سررشتۂ تعلیمات میں داخل ہو گئے۔ اور کچھ ہی دن بعد اورنگ آباد میں انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اردو کی خدمت کر کر کے اور نام پیدا کرتے گئے۔ ۱۹۱۲ء کے اخیر سے انجمن ترقی اردو کا کام ہاتھ میں لیا۔ اور اُس کے سکرٹری ہو کر اُسی کے ہو کر رہ گئے۔ ایک اس کام کے پیچھے دن رات ایک کرتے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ کے کرتا دھرتا بھی رہے، اور اُس کے ناظم کی حیثیت سے بھی رہے۔ مصطلحات علمی کی جو مجلس تھی، اس میں خوب گرما گرم بحثیں ہوتیں اور نوبت ذاتیات کی آجاتی۔ سائنس کی ایک ایک اصطلاح کے گڑھنے میں لوہے لگ جاتے ایکطرف

مولانا حمیدالدین فراہی ہوتے اور وحیدالدین سلیم، دوسری طرف مرزا کوکب اور سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ جھگڑے ہوتے، چوٹیں چلتیں اور ثالث اکثر یہی عبدالحق بنتے۔ اس نظامتِ سررشتۂ ترجمہ سے ترقی کر کے جامعۂ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ہو کر آ گئے۔ اور پھر جب اس سے بھی ریٹائر ہوئے تو منتقل ہو کر دہلی آئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ جیسے بجائے بوڑھے ہونے کے اور زیادہ جوان ہو گئے ہیں! ہمت و مستعدی، بیدار مغزی اور کارکردگی میں اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے —— بچارے نے بہت چاہا کہ سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ ہو کر خدمت اردو کے لیے اپنے کو وقف رکھیں، اسی پر جئیں اور اسی پر دنیا سے اٹھیں، پوری طرح کامیاب نہ ہو پائے۔ پاسپورٹ ہند و پاکستان دونوں کے بنوا لیے۔ بہت چاہا کہ ایک قدم دہلی اور علی گڑھ میں رکھیں، دوسرا کراچی و لاہور میں۔ لیکن دونوں ملکوں میں کام کسی طرح ممکن نہ ہوا، مجبوراً اپنے کو کراچی میں محصور کر لیا۔ طوفانی دوروں سے ڈھاکہ اور چاٹگام تک کو ہلا ڈالا۔ سرگرم جوشِ عمل سے مردوں کو جلا دیا۔ کتنوں کو گمنامی کے قعر سے گھسیٹ کر بامِ شہرت پر لے آئے۔ کتنوں کے نام چمکا دیے۔ فلکِ کج رفتار کو اکی بے ہمتائی نہ بھائی اور اپنوں ہی نے مخالفت کی ٹھان لی۔ وہ ایک ہمت کا دھنی کسی سے ہار نہ مانا۔ تن تنہا سب سے مقابلہ کرتا رہا، ایک ایک سے ٹکر لیتا رہا۔ عمر کی ۸۰ سے زائد منزلیں طے کر کے عالمِ آخرت کو سدھارا۔ دنیا اس کی تحقیق کی داد دیتی رہے گی۔ اور نسلیں اس کے عزم و فرض شناسی کی بلائیں لیتی رہیں گی۔

عمر بھر شادی نہ کی، تجرد میں گزاری۔ سالہا سال ایک محبوبۂ دل نواز کی چاہت میں گزار دیے۔ زندگی اُس پر تج دی، دن رات اس کے فراق میں گرفتار، نہ یہاں قیام نہ وہاں قرار۔ ع

دن کہیں، رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

کا مصداق۔ بہ قول کسی عامی سیلانی کے ؎

سالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے
جنوری تو ہے تو اے ماہ دسمبر ہم ہیں!

اس بے پناہ عشق و اشتیاق و الفت کی دھن میں ایجاب و قبول کی نکر کسے اور قاضی اور

شاہدین کا ہوش کہاں! محبوبہ کا نام ہے زبان اردو، اور اس پر دل دینے والے کا نام عبدالحق بوڑھا کنوارا۔ بس نام ہی "کا کنوارا" نکلا ـــــــ عبدالحق نے جتنی گہری اور جتنی وسیع خدمت اُردو کی کی، اگر اس کا جائزہ لینے پر آئیے تو خود ایک عمر کی چھان بین اور برسوں کی مشقت کی ضرورت ہے۔ دیکھئے کب اور کون اتنی ہمت کر پائے!

دوستوں بلکہ دشمنوں تک کے کام آنے والا، غیروں اور اجنبیوں کو نفع پہنچانے والا، خود اچھا کھانے والا، اس سے بڑھ کر دوسروں کو اچھا کھلانے والا، بے غرض خدمت گزاری کا پُتلا خدمت خلق ہی کو اپنا مذہب بنا لینے والا، کوئی شریف انسان عبدالحق کا سا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے اور یقین ہے کہ جب دنیا میں اس کا وقت موعود آیا تو توحید اور رسالت کی گواہی دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا ـــــــ انھیں کے ہم نام اور بہترین مسلمان۔ افضل العلماء عبدالحق کرنولی ثم مدراسی مرحوم نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں بابائے اُردو اور فلاں مولوی صاحب کے ہمراہ اڈیار (مدراس) کے تھیاسوفسٹ باغ میں جب مغرب کے وقت گزرا تو بابائے اُردو نے کہا کہ یہاں تو نماز ضرور پڑھی جائے اور اس کے بعد خود ہی نماز کی اذان دی۔ اور نماز مغرب جماعت کے ساتھ انھیں مولوی صاحب کے پیچھے ادا کی۔

مرزا رسوا

(متوفی سنہ ۱۹۳۱ء)

اصل نام مرزا محمد ہادی ہے۔ ناول لکھنے بیٹھے، تو چہرے پر نقاب مرزا رسوا کا ڈال لیا۔ لکھنؤ کے شریف زادے تھے۔ اور لکھنؤ کے ایک خاص طبقۂ شرفا میں ناول نویسی اُس وقت تک معیوب تھی (گو شاعری اور غزل گوئی بالکل نہیں) شاعری میں ان کا تخلص مرزا تھا۔ اور اسے اپنے نام سے ملا کر بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ لیکن "رسوا" کو اپنے نام ملا کر کبھی بھی استعمال نہ کرتے "مرزا رسوا" کی ترکیب تمام تر بعض کرم فرماؤں کی عنایت ہے ——— زمانے کی ستم ظریفی کہ یہی فرضی نام (مرزا رسوا) ہی دیکھتے دیکھتے چل پڑا۔ مرزا محمد ہادی مرزا کو اب کون جانتا ہے؟

اصلاً فارسی، عربی، و شعبۂ دینیات کے عالم تھے، انھیں علوم کی تعلیم باضابطہ حاصل کی تھی۔ اور انھیں کی تحصیل و تکمیل میں ایک عمر گزار دی۔ انگریزی بڑے ہو کر اپنے شوق سے نج کے ہی طور پر پڑھی ذہین، طباع، اور شائق علم شروع سے تھے، انگریزی میں بھی اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ خطوط وغیرہ بے تکلف انگریزی میں پڑھنے لگے۔ اور پرائیوٹ امتحان بی اے کا دے کر اسے پاس کر لیا——— اس وقت بی اے کی ڈگری آج کی پی، ایچ ڈی سے کہیں بڑھ کر تھی۔

فلسفۂ یونان، فلسفۂ یورپ، ریاضیات و فلکیات ان فنون میں خاصا دخل تھا۔ اور عملی تجربے بھی فلکیات کے سلسلے میں اپنے دالے خوب خوب کرتے۔ شاعری اور سخن فہمی شکم مادر ہی سے لے کر آئے تھے۔ اور زبان کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ اہل زبان کے خاص طبقۂ خواص میں سے تھے۔ شاگرد مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج کے تھے اور لکھنؤ میں رُکنِ اعظم بزم دبیری کے رہے۔

لکھنؤ کا ایک غریب پرور اور غریب نواز کالج (امریکیوں کا قائم کیا ہوا) ریڈس کرسچین کالج

(REID's CHRISTIAN COLLEGE) کے نام سے تھا اس میں پہلے فارسی کے مدرس ہوئے۔ پھر منطق وغیرہ دوسرے مضمون بھی پڑھانے لگے اور شاید فلسفہ بھی۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہ ملتی، مگر یہ سادگی پسند آدمی، اس میں بھی ہنسی خوشی گزر کر لیتے۔

ناول خوب لکھے، اور جو لکھے بس قلم برداشتہ ہی لکھے۔ ایک نستعلیق طوائف کی خودگزشت امراؤ جان ادا کے نام سے لکھی، اور کہا جاتا ہے کہ ایک رات میں لکھ ڈالی، اس میں زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے ناولوں میں بہترین ناول یہی ہے۔ کتاب موضوع کے لحاظ سے جتنی بھی فحش ہوتی، کم تھا۔ لیکن شرافت تحریر کا کمال ہے کہ حال اس کے برعکس ہے۔ بجز ایک آدھ اشارے کنائے کے کتاب بھر میں فحش ایک جگہ بھی نہیں۔ دوسرے ناول اور بھی اچھے اور پڑھنے کے قابل ہیں مثلاً افشائے راز (افسوس ہے کہ بالکل ناتمام رہا) اختری بیگم، ذات شریف، بعض انگریزی سے ترجمہ ہیں۔ مثلاً خونی مصور، بعض تمام تر اصلاحی ہیں مثلاً شریف زادہ، اور ہلکا اصلاحی رنگ تو اکثر ناولوں میں ہے۔

بعض زمانوں میں شیعہ مذہب سے لگاؤ بہت زیادہ بڑھ جاتا تو اس وقت شاعری ناول نگاری، فلسفہ وغیرہ سب دب جاتے اور قلم مناظرے کا رنگ اختیار کر لیتا۔ ایک دفعہ دیکھا کہ ایک ضخیم کتاب کا مسودہ کئی جلدوں میں لکھا ہوا الماری میں رکھا ہوا ہے۔ پوچھنے پر بتایا کہ تحفۂ اثنا عشریہ (شاہ دہلوی) کا جواب ہے۔ اور جب میں نے شکایتاً کہا کہ یہ کیا تضیع وقت فرمائی تو بولے کہ تضیع وقت کیسے؟ آپ نہیں فلاں ادیب اور فلاں شاعر کا مقابلہ ومحاکمہ دوسرا ادیب وشاعر سے کیا کرتے ہیں۔ بس علمی انداز سے تحقیق کی ہے، کوئی گالم گلوچ تھوڑے ہی کیا ہے" اب اصلیت کا علم اللہ کو ہے۔ کتاب کا مسودہ سنا ہے کہ مدرسۃ الواعظین میں محفوظ ہے ـــــ ایک زمانے میں رسالہ الحکم نکالا تھا۔ اس میں اخلاقی، دینی، کلامی مضمون ہوتے اور دہریت وبے دینی کی تردید۔ ایک لمبا مکالمہ "آزاد" اور "ہادی" کے فرضی ناموں سے چھپنا اب تک یاد ہے۔

عجیب وغریب متضاد صفات کے حامل تھے، ایک طرف ریاضی، فلسفہ، اور فلکیات سے

خشک علوم میں انہماک، دوسری طرف رنگین مزاجیوں میں بھی کوئی کمی نہیں۔ جوانی کے زمانے میں جب کبھی روپیہ ہاتھ لگ جاتا تو جوانی دیوانی اور شوقین مزاجی کا حق ادا کر ڈالتے یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں میں تھا۔ روپیہ اتفاق سے کبھی ہاتھ لگ جاتا تو خوب اللّے تللّے اڑاتے دعوتیں، جلسے، گانا بجانا" غرض جو گنہ کیجے ثواب ہے آج "۔ جب ختم ہو جاتا تو پھر وہی صبر و شکر، تسلیم و رضا، سادگی، قناعت کی زندگی۔

غالب کے بڑے مداحوں بلکہ عاشقوں میں تھے۔ لیکن ان کے کلام کے بس اسی حصے کو مانتے تھے جو سادہ، سہل اور بے تکلف ہو۔ پیچیدہ اور مغلق شعر سے متعلق صاف کہہ دیتے کہ یہ شعر نہیں فلسفہ ہے۔ فرماتے تھے کہ "ایک زمانے میں مجھے غالب کے کلام سے اتنا انہماک تھا کہ برسوں اس طرح سویا ہوں کہ دیوان غالب تکیہ کے نیچے رہتا تھا۔ لیکن داد انھیں اشعار کی دیتا جو سنتے ہی بے تکلف سمجھ میں آجائیں۔ جہاں کسی شعر پر دماغ سوزی کرنا پڑی، تو سمجھ لیتا ہوں کہ یہ میرے لیے نہیں"۔

یہ بات البتہ ذرا عجیب سی ہے کہ ناولوں میں زبان اس درجہ شگفتہ، سلیس لکھتے کہ پڑھنے سے سیری نہ ہوتی، لیکن علمی مضمونوں اور مقالوں میں زبان ہرگز سادہ سلیس نہ ہوتی۔ اس باب میں امامت کا درجہ مولانا شبلیؒ ہی کو حاصل تھا۔

ایک دوسری بات بھی اسی سلسلے کی، یہیں سن لیجئے۔ اپنے معاصر نثر نویسوں کو خاطر میں نہ لاتے۔ حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد کو کوئی خاص درجہ نہ دیتے (گو ان کی ہجو بھی نہ کرتے) ہاں مولانا شبلی کے لیے البتہ کہتے کہ "ہاں مولوی شبلی صاحب سوچ سوچ کر لکھ لیتے ہیں"

میں اپنی کالجی طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک شیعہ ساتھی سید کلب عباس (موجودہ شیعہ لیڈر) کے ساتھ جاکر ملا۔ بڑی بے تکلفی سے ملے۔ وقتاً فوقتاً ملنا ہوتا رہا۔ اور کبھی کبھار خود بھی زحمت فرماتے ایک بار میری درخواست پر راجہ صاحب محمود آباد سے ملنے سرشار صاحب کے ساتھ گئے۔ عمر کے اخیر ۱۲، ۱۳ سال حیدر آباد میں گزار دیے۔ وہاں بھی دو چار بار ملاقات ہوئی۔

ایک بار حضرت اکبر الہ آبادی کے سامنے ان کا ذکر آیا۔ میں نے شاید ان کے تعدد ازدواج کا

ذکر کیا۔ اکبرؔ نے فرمایا کہ "پھر اولاد بھی کثرت سے ہوگی جبھی تو میں نے کہا ہے" ؎

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آجاتی ہے

جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

شیعہ سُنی لکھنؤ میں عام طور سے تو اتحاد و اتفاق سے رہتے ہیں، لیکن ہر چند سال کے بعد شدید اور ہولناک قسم کا نفاق و شقاق بھی ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ یہی دَور تھا، غالباً ۱۹۰۶ء میں۔ خواجہ غلام الثقلین (علیگ) فریقین میں اتحاد کے علمبردار تھے۔ شیعہ کانفرنس کے نام سے ایک نئے ادارے کی بنیاد پڑی اور پہلا جلسہ دھوم دھام سے رفاہ عام کی عمارت میں ہوا، خواجہ صاحب تقریر کے لیے اٹھے اور کچھ باتیں وعظ و نصیحت کی اپنے فریق کو سنائیں۔ ایک بڑے مجتہد صاحب بگڑ گئے اور کرسی سے نیم خیز ہو کر کہا کہ "میں ایسی تقریر کا سُننا حرام جانتا ہوں۔" خواجہ صاحب کیا دبنے والے تھے۔ تیوروں کے ساتھ بولے "میں ایسے جلسے میں تقریر کرنا حرام جانتا ہوں" اور جلسے سے نکل آئے۔ ساتھ دینے والے ایک مرزا صاحب ہی تھے۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جب میں حیدر آباد سے استعفا دے کر لکھنؤ واپس آگیا، تو اپنے استعفا نامے میں اپنے بجائے دو نام پیش کر آیا تھا۔ ان دو میں ایک مرزا صاحب تھے اور دوسرے مولانا عبد الباری ندوی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ دونوں صاحب لے لیے گئے۔ مولانا ندوی تو یونی ورسٹی میں لے لیے گئے اور مرزا صاحب تالیف و ترجمہ کے کام پر سررشتۂ تالیف و ترجمہ میں۔ نفسیات وغیرہ کے موضوع پر کئی کتابیں لکھ آئے۔ اگست ۱۹۳۱ء میں وہیں انتقال کیا اور باغ مُرلی دھر کے شیعہ قبرستان میں دفن ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی

(متوفی ۱۹۵۵ء)

ابھی اسکول کے کسی درجے کا طالب علم ہی تھا کہ یہ نام بہ حیثیت مضمون نگار کے کان میں پڑنے لگا، کالج میں تھا کہ مولانا شبلی کی زبان سے ان کی "بھاشا آمیز اردو" کی تعریف سنی۔ دل پہلے ہی سے ان کی طرف کھنچا ہوا تھا کہ اب تو اتنی بڑی سند بھی ہاتھ آگئی۔ اور ایک مضمون کی تمہید میں مولانا ابوالکلام کے قلم سے بھی ان کی مدح دیکھی۔ مولانا شبلی کی داد بجائے خود کیا کم تھی، کہ اب وہ شہادت اور موثق ہو گئی۔ ان کا ہر مضمون، ہر اخبار شوق و اشتیاق سے پڑھنے لگا۔

۱۹۱۳ء میں ایک بار دہلی جانا ہوا، اتفاق سے آگے تانگہ خواجہ صاحب کا جا رہا تھا، نظر پڑتے ہی پہچان لیا، تصویریں بار بار دیکھ چکا تھا، اور زلفوں والا چہرہ بھولنے والا نہ تھا۔ اب یہ یاد نہیں پڑتا کہ ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ غالباً دہلی ہی میں ہوئی۔ میں پرانی دہلی کے کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہیں ہوئی۔ سنہ بھی کوئی ۱۴ یا ۱۵ ہو گا اور تھوڑے ہی دن میں تعلقات یگانگت کی حد تک پہنچ گئے۔ مزے مزے کے خط آتے، ان کی بزرگی اور درویشی کا میں کچھ زیادہ قائل نہ ہو سکا لیکن ان کے صاحب قلم ہونے کا احساس برابر بڑھتا رہا۔ ادیب تو اردو میں بہت دیکھنے میں آئے۔ لیکن خواجہ صاحب صاحب طرز تھے اور سلیس اردو، صحیح، عام فہم زبان لکھنے میں انھیں ملکہ تھا۔

پیرزادگی اور صوفیت کا کاروبار ان کے ہاں بڑے پیمانے پر جاری رہا۔ بہ قول بعض خوش عقیدہ مریدوں کے ؎

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں!

البتہ ان کی انشاء پردازی کا سکہ دل پر اور زیادہ ہی بیٹھتا رہا۔ اور ادب اردو کے ان

ظالم تاریخ نگاروں پر غصہ اور افسوس ہی کرتا رہا، جنھوں نے خواجہ صاحب کے ذکر سے اپنی تاریخوں میں پرہیز کیا ہے۔ ایک زمانہ مجھ پر ایسا گزرا ہے جب میں حضرت نظام الدین سلطان المشائخ کا غیر معمولی طور پر معتقد تھا۔ اسی سلسلے میں ایک سے زائد بار دہلی حاضر ہو کر خواجہ صاحب کا نمک خوار بننا پڑا۔ اور ایک مرتبہ تو غالباً ۱۹۲۲ء کے اخیر میں خواجہ صاحب کا مہمان مستقل ۳۰، ۳۵ دن تک رہا۔ گیا اس ارادے سے تھا کہ خواجہ صاحب سے صرف جگہ کا طالب ہو کر اپنا کھانا پینا الگ رکھوں گا اور اسی خیال سے کھانا پکانے کے لیے آدمی بھی ساتھ لے گیا اور ساتھ ہی کچھ برتن بھی، مگر خواجہ صاحب کسی طرح نہ مانے، آخر میں مجھی کو ہار ماننا پڑی۔ ساری مدت خواجہ صاحب نے جس سیر چشمی سے اپنا مہمان رکھا اس کی یاد بھی جب آجاتی ہے، نظریں شکر گزاری اور احسان مندی کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ جب عرس کا زمانہ آگیا اور میری واپسی کو کوئی عشرہ باقی رہ گیا، تو میری بیوی بھی آگئیں۔ ایک لڑکی اور اس کی انّا بھی ساتھ تھیں۔ یہ چار پانچ آدمیوں کا قافلہ پوری شان بے تکلفی سے خواجہ صاحب کا مہمان بنا رہا ——— ۱۹۱۸ء میں خواجہ صاحب سے حیدر آباد میں بھی ملاقات رہی۔ وہاں وہ بڑے لوگوں (مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری وغیرہ) کے ہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے، اور میں سر رشتۂ تالیف و ترجمہ میں ایک معمولی سا عہدہ دار تھا۔ حیدر آباد میں یہ معاشی اونچ نیچ بہت دیکھی جاتی تھی۔ اور کوئی "بڑا"، کسی "چھوٹے" کے ہاں آنے میں اپنی بڑی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کا ذرا خیال نہ کیا اور بتا لگا کر خود ہی ایک دم سے میرے گھر آگئے۔ کہیں اور اہم ہو یا نہ ہو حیدر آباد میں یہ بہت اہم تھا۔ خواجہ صاحب کی تنہا یہی ایک ادا انھیں بڑا بنا دینے کے لئے کافی تھی۔

خواجہ صاحب صحیح معنی میں ایک خود ساختہ (SELF MADE) آدمی تھے، انھوں نے نہ اپنی پیرزادگی پر تکیہ کیا، نہ رسمی سجادگی کے پھیر میں پڑے۔ بلکہ اپنی محنت و جانفشانی سے، اپنی حکمت و تدبیر سے معاشرے میں اونچی جگہ پیدا کر لی۔ اور کسی اونچی سی اونچی شخصیت سے ہیٹے نہ رہے۔ بہ حیثیت مجموعی وہ بڑے بامروّت، خوش اخلاق، مہمان نواز، اور بڑے دلچسپ و

باغ وبہار آدمی تھے۔ عقل[ا] دنیا بھی خوب رکھتے تھے حضرت اکبر الہ آبادی سے نیاز مندی میں میرے کامیاب حریف تھے، وہ شعر ملاحظہ ہو ؎

حسن نظامی اکبر کا کلام سُن کے بولے
تجھے ہم ولی سمجھتے جو تو خرقہ پوش ہوتا

ایک حسن نظامی یہ تھے، میرے دوست اور مخلص، محسن وعنایت فرما، متواضع ومنکسر، فیاض ومہمان نواز، اردو کے مایہ ناز انشاء پرداز۔ لیکن ایک دوسرے حسن نظامی بھی تھے۔ دینی شخصیتوں (مثلاً امام بخاری) کی توہین کرنے میں اہل سنت کی دل آزاری کی پروا نہ کرتے۔ اور مجاہد امت اور پیشوائے ملت محمد علی مرحوم کو نیچا دکھانے میں ناگفتہ حدود تک پہنچ جاتے۔ ان دوسرے حسن نظامی کا معاملہ بس اللہ ہی کے حوالے کرتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ ان کی خوبیوں اور ان کی شان جمالی کے طفیل میں ان کی لغزشوں اور بشری کمزوریوں کو دامن عفو میں ڈھانپ لیا جائے اور ان کی نیکیوں کو ان کا شافع بنالیا جائے اور اپنے دلچسپ دوست کے حق میں توقع رکھے ہوئے ہوں کہ انشاء اللہ جنت میں ضرور ان کی دلچسپ گفتگو لطف دے گی۔

[ا] مولوی ظفر علی خاں لاہوری مرحوم (ایڈیٹر زمیندار) کی طنزیہ نظم خواجہ صاحب کی مخالفت میں چھپی تھی اس کا ایک شعر یہ تھا ؎

درویش بھی رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی اور یا دخواجہ کو ہیں تجارت کے ڈھنگ بھی

"عقل دنیا" کی تلمیح کے حل ہونے میں شاید اس سے کچھ مدد مل جائے۔

سیّد کرامت حسینؒ

(متوفی ۱۹۱۷ء)

ضلع بارہ بنکی میں ہمارے قصبے سے شمال مغرب میں کوئی ۱۴، ۱۵ میل دور ایک قدیم قصبہ کِنتور شیعہ علماء و شیعہ شرفا کا مرکز خصوصی۔ لکھنؤ کے مشہور ترین شیعہ مجتہدین، مولانا ناصر حسین اور ان کے والد مولانا حامد حسین صاحب "عبقات الانوار"، یہیں کے تھے۔ انھیں سید حامد حسین کے ایک بھتیجے سید کرامت حسین تھے۔

عربی تعلیم اپنے رواج خاندانی کے مطابق حاصل کی اس کے بعد انگریزی پر متوجہ ہوئے۔ پھر ولایت جاکر بیرسٹر ہوئے۔ اور الہ آباد میں پریکٹس شروع کی کچھ دنوں شاید علی گڑھ کالج میں قانون کے استاد بھی رہے، پریکٹس تو کچھ ایسی نہیں چلی، البتہ ان کی قانونی قابلیت اور نکتہ رسی کا سکہ معاصرین بلکہ ہائی کورٹ کے ججوں تک پر بیٹھ گیا۔ قانون کے نظریات کے ساتھ دو اور فنون میں ماہرانہ شہرت حاصل کرلی، ایک انگریز فلسفیوں میں اس زمانے میں ہربرٹ اسپنسر (۱۹۰۳ - ۱۸۲۰ء) تھے۔ اس کی ضخیم جلدوں کو یہ ایسا چاٹ گئے، اور اس کثرت سے انھیں پڑھا، کہ لوگ انھیں "حافظ اسپنسر" کہنے لگے۔ اس کے فلسفے سے بہت ہی متاثر ہو کر آئے یا یوں کہیے کہ اس کے مرید ہوگئے۔ اسپنسر کوئی مذہبی آدمی نہ تھا۔ آزاد خیال، عقل پرست، نیم ملحد سا تھا۔ اپنے کو "لاادری" (Agnostic) کہتا تھا۔ لکھنے میں بڑا مہذب و شائستہ۔

تو ایک فن تو یہ ہوا "اسپنسری فلسفہ" دوسرا فن تھا لسانیات عربی، اس میں بھی نام اور امتیاز پیدا کیا اور آگے چل کر ایک کتاب فقہ اللسان تین حصوں میں لکھی۔ چیف جسٹس نے انھیں بنچ پر لے جانے کی تحریک کی، اور یہ ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔ بڑے کم گو تھے، اور لوگوں سے ملنے ملانے سے بھی

گریز کرنے والے۔ اب تو جانتا کون ہے، اس وقت کے جوہر شناسوں نے پہچانا، پرکھا، اور خوب قدر کی۔ ان کی قانونی موشگافیوں کی دھوم مچ گئی۔

مسلمانوں کی عام سرشت و عادت کے خلاف یہ بڑے کفایت شعار اور سادہ مزاج بھی غضب کے نکلے۔ بیوی بچوں کے بکھیڑے سے بھی آزاد رہے۔ ذاتی خرچ بہت ہی کم رکھا۔ الہ آباد کا ایک زنانہ انگریزی مدرسہ (گرلز اسکول) خوب چلایا۔ اس کے بعد شاید ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ منتقل ہو کر ایک مستقل زنانہ درسگاہ مسلم گرلز کالج کے نام سے راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی میں کھول دی اور ایک نومسلم خاتون ڈاکٹر مس آمنہ پوپ کو اس کی پرنسپلی پر لندن سے بلوالیا۔

وقت کی ایک نئی سی چیز تھی، شہرہ ملک بھر میں ہوگیا۔ میں (اُس وقت "آزاد خیال" اور مُلحد) بی۔اے کا طالب علم تھا۔ ایک نومسلم انگریزہ خاتون کو اعجوبہ سمجھ کر ان سے ملنے گیا۔ معلوم ہوا کہ عقیدے کے لحاظ سے پختہ مسلمان ہے۔ اعتراف کیا کہ سید امیر علی کی کتابیں اسپرٹ آف اسلام وغیرہ پڑھ کر مسلمان ہوئی ہیں ۔ یہ امیر علی خود ہی مولویوں کے حلقے میں تمام تر بددین مشہور رہتے، کلکتہ ہائیکورٹ کے ایک فاضل اور نامی گرامی جج تھے۔ پنشن کے بعد خود بھی وہیں چلے گئے۔ انگریز ایک جوہر شناس قوم تھی۔ انھیں پریوی کونسل میں لے لیا۔ کوئی مسلمان کیا معنی کوئی ہندوستانی اس وقت تک اس منصب پر نہیں پہنچا تھا۔ شادی بہت پہلے ہی ایک انگریزی خاتون سے کر چکے تھے۔ رائٹ آنریبل کہلائے اور وہیں وفات پائی غالباً ۱۹۱۷ء میں۔

کرامت حسین کا قیام اب مستقل لکھنؤ میں ہوگیا۔ فلسفے کے رشتے سے میں نے بھی نیازمندی کا حق حاصل کیا۔ ملا اور کبھی کبھی حاضری دینے لگا۔ اسپنسر کا میں خود بھی معتقد تھا، یہ مجھ سے بھی کہیں آگے نکلے۔ بغیر ٹیم ٹام اور نام و نمود کے، مسلمانوں کی عام حالت کے بالکل برعکس زندگی بسر کردی، کھانا بڑا ہی سادہ کھاتے، البتہ دہی بڑی مقدار میں کھاتے۔ باقی گوشت وغیرہ اور تکلفات سے گویا محترز رہتے۔ جو کچھ بچاتے، کسی نہ کسی کارِ خیر میں دے ڈالتے۔ غضب کے متواضع و منکسر مزاج تھے۔ ہر ایک سے

جُھک کر ملتے، ہر ایک کا کام کرنے والے، اور اسے مشورۂ نیک دینے کو تیار، میری شادی (جون ۱۹۱۶ء) میں شریک ہوئے، محفل عقد میں مجھ سے قریب، مسندِ نوشاہی سے متصل، ایجاب و قبول کے وقت جب فرضی مہر لاکھوں روپیوں کا ہنیں، اشرفیوں کا بندھنے لگا، تو مجھے بے دھڑک ٹوکا، "یہ کیا غضب کر رہے ہیں آپ، ایسی فرضی رقم بھی کہیں درست ہو سکتی ہے؟" — عام مسلمان ان سے شہر میں ناخوش ہی رہے اور شیعہ برادری تو اور زیادہ۔ بس گنتی کے کچھ لوگ ان کے تھے، ایک راجہ صاحب محمود آباد، دوسرے بیرسٹر اور شاعر حامد علی خاں، تیسرے چودھری محمد علی تعلقہ دار ردولی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں جب اردو رسم الخط پر حملہ پہلی بار اسی صوبے میں ہوا، مسلمانوں کو چونکا دینے والا، یعنی ناگری رسم الخط بھی اردو کے ساتھ عدالتوں میں جائز قرار پا گیا تو مسلمان بہت ہی جز بز ہوئے۔ خوب اُچھلے کودے، گویا ایک زلزلہ سا آ گیا۔ ایک ڈیفنس ایسوسی ایشن (مجلس دفاعِ اردو) قائم ہوئی۔ اس مجلس نے ناگری والوں کے پمفلٹ کے جواب میں ایک لمبا چوڑا پمفلٹ انگریزی میں تیار کیا، ہر طرح مدلل و مفصل یہ دراز قد پمفلٹ انھیں کرامت حسین ہی کا مرتب کیا ہوا تھا، آج اتنے دنوں کے بعد بھی زیارت کے قابل ہے۔

ایک کارنامہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر اپنی یادگار عربی میں چھوڑ گئے۔ لسانیات کے ماہر تھے ہی، عربی لسانیات پر تین جلدوں میں ایک کتاب فقہ اللسان کے نام سے لکھ گئے۔ دعویٰ یہ کیا ہے کہ عربی کے مصدر محاکی الصوت (MONOPOLIC) ہیں، یعنی ان کی آوازیں محاکی الصوت کی قدرتی آوازوں کے مشابہ ہیں۔ پھر اسی اصل سے بیسوں ثانوی و مجازی معنی پیدا ہوتے گئے۔ پہلی جلد ساری کی ساری مقدمے کی نذر ہے، جس میں نظریات سمجھائے ہیں اور باقی دو جلدوں میں کوئی ساڑھے ۶ ہزار سے اوپر الفاظ آ گئے ہیں۔ اور ایک کتاب انگریزی میں ڈیڑھ سو صفحے کی دو کالمی DERIVATION OF ARABIC ROOTS. اس کے ضمیمے کے طور پر ہے۔ ایک رسالہ فلسفۂ اسپنسر پر الدین دالکون کے نام سے لکھا۔ لکھنے والے اچھے نہ تھے۔ اردو میں بھی جو لکھتے، خشک، کرخت

اور بے لچک لکھتے۔ ایک مقالہ انزاد کا سیہ پر بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ کے ایک جلسے میں خود ہی پڑھا خود ہی سمجھے۔ لکھنؤ کے بے فکرے شاید کوئی تفریحی خاکہ سمجھ کر آئے تھے۔ جل کر طرح طرح کی فقرہ بازیاں کرتے رہے

آخر عمر میں محمود آباد ہاؤس میں اُٹھ آئے تھے، والی محمود آباد سر علی محمد خاں جوہر شناس اور علم نوازی میں اپنا جواب آپ ہی تھے۔ ایک ضخیم کتاب المرأۃ کے عنوان سے لکھ رہے تھے عورت کے موضوع پر گویا ایک انسائیکلوپیڈیا تیار ہوتی۔ اور گفتگو دینی، اخلاقی، قانونی، طبی، سائنسی شاید ہر پہلو سے ہوتی۔ بدر کامل بنتے بنتے رہ گیا۔ مسودہ ناتمام رہا۔ اور افسوس ہے کہ مسودہ بھی کہیں غائب ہو گیا، مدتوں میرے قبضے میں رہا تھا۔

صحت عام طور پر اچھی تھی۔ کچھ ایسا بیمار بھی نہ تھے، رات کو سوئے تو بس سوتے ہی رہ گئے۔ سُنا ہے کہ وفات پر عزیزوں نے تدفین میں بڑی بحثیں نکالیں۔ سوال اُن کے عقائد کا پیش ہوا اور کہا گیا کہ وہ سرے سے مسلمان ہی نہ تھے تو مسلمانوں کے قبرستان میں اُن کے لئے جگہ کیسی!

بات کے بڑے دھنی اور وعدے کے بہ شدت پابند تھے۔ اپنے اوپر بڑی سی بڑی تکلیف اٹھا لیتے، وعدے کو پورا کیے بغیر نہ رہتے۔ اس کے قصے طرح طرح کے مشہور ہیں۔ اپنی حکمت و موعظت سے پتھر کو موم بنا لیتے۔ ایک انگریز جج ہائیکورٹ کی بابت روایت ہے کہ عادتاً و عموماً ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا کرتا، ایک روز سید صاحب کو موقع مل گیا۔ بڑی نرمی سے بولے کہ "غصہ تو وہ انسان کرتا ہے، جس کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہوتا، آپ کو تو پھانسی پر چڑھا دینے تک اختیار حاصل ہے۔ آپ چیخ کر کیوں بولتے ہیں، آپ تو بڑے نرم لہجے میں بھی جو حکم دیں اس کی بھی تعمیل ہوگی، آپ کیوں نہ اپنا لہجہ سادہ، نرم اختیار فرمائیں،، نصیحت کارگر ہو گئی۔

آفتاب احمد خاں

(متوفی سنہ ۱۹۳۰ء)

علی گڑھ نے جو مشاہیر سرسید کے پیروؤں میں پیدا کیے، ان میں ایک اہم نام آفتاب احمد خاں کا ہے۔ صاحبزادہ کے متعلق تو کچھ اور تحقیق نہیں، سوا اس کے کہ خاندانی نام کا کوئی جزو ہوگا۔ پنجاب اور یو۔ پی کی حد پر کہیں کے رہنے والے تھے۔ سرسید کی زندگی کا آخری دور تھا کہ علی گڑھ پڑھنے آئے۔ خوب گورے چٹے، سرخ و سفید اور چہرے کی قطع بالکل انگریزوں کی سی، پڑھائی اور کھیل دونوں میں خوب چمکے، پھر پڑھنے کیمبرج گئے، وہاں سے بی۔ اے کیا اور لندن سے بیرسٹری۔ کالج میگزین (اردو) میں کیمبرج پر اس وقت لکھتے رہے، سرسید کے بعد اپنی زندگی ہی علی گڑھ کے لئے وقف کردی۔ وہیں شاندار کوٹھی آفتاب منزل کے نام کی بنالی اور بحیثیت بیرسٹر فوجداری کے کام میں نام پیدا کیا۔ دوسرے ضلعوں میں بھی قتل ڈکیتی وغیرہ میں برابر بلاوے آتے رہتے تھے۔ پیشے سے بھی بڑھ کر قومی ملی کاموں میں مصروف رہے، اور کالج اور کانفرنس کے لئے زندگی وقف کردی۔ مضمونوں کے سیکڑوں صفحے لکھ ڈالے اور تقریریں بے شمار کر ڈالیں۔ لکھنے والے تو اوسط درجے کے تھے، لیکن بولنے والے بڑے اچھے تھے، بڑے سلجھے ہوئے اور بڑے مہذب و شائستہ لہجے میں، مدلل اور دل پذیر تقریر کرتے۔ کانفرنس کے سارے کرتا دھرتا رفتہ رفتہ خود ہی ہو گئے۔ ایک عالی شان عمارت "سلطان جہاں منزل" والیۂ بھوپال کے نام سے بنوالی۔ مزاج میں نظم و انضباط وافر تھا ہر بات نہایت مرتب و باقاعدہ کرتے ضبط نفس دیانت و فرض شناسی کا ایک مجسم پیکر تھے۔ اور جسمانی زندگی میں ضبط و نظم کا ایک نمونہ تھے۔ کھانا کھانے ہی کے نہیں پانی پینے تک کے وقت بھی مقرر اور مقدار بھی مقرر۔ پیدل چلنے کا ناغہ حتی الامکان

سفر تک میں نہ ہونے دیتے ۔ نماز کے پوری طرح سے پابند ۔ یونیورسٹی قائم ہونے کے کئی سال
بعد وائس چانسلری کے لئے ان کا نمبر بھی آیا ، گھس بیٹھ والے آدمی بالکل نہ تھے ۔ اپنے کو پیچھے ہی
رکھتے ۔ یونیورسٹی میں یہ اندھیر ہو رہا تھا اُس نے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ انھیں کو آگے کریں ، آتے ہی
انھوں نے انتظامات کی پابندی کرادی اور ہر گڑبڑ کی اصلاح ۔ یونیورسٹی کی مسجدوں میں خود آنا
شروع کیا ۔ خصوصاً نماز فجر میں ۔ اور کسی دن اذان بھی خود ہی دی ۔ کچھ روز ولایت ، وزیر ہند
کی کونسل کے ممبر ہو کر چلے گئے تھے ۔ اُس وقت تک ولایتی سفر آسان نہیں ، سمندری جہازوں
سے ہوتے تھے ۔ اخباروں میں نکلا تھا کہ سمندری جہاز میں صاحبزادہ صاحب نے خود اذان دے کر
نماز پڑھی تھی ۔

کالج کے فرزندوں میں اگر انھیں کے سے دیانتدار صاحب فہم زیادہ تعداد میں پیدا ہو گئے
ہوتے تو علی گڑھ کی نیک نامی کا شہرہ دنیا بھر میں ہو گیا ہوتا ۔ اور مسلم قوم بغیر شرم سے نیچی نظر
کئے ہوئے ساری دنیا کے سامنے اپنا چہرہ دکھا سکتی ۔

آخر عمر میں بڑی طویل بیماری فالج کی اٹھائی ۔ علاج کے لئے پہاڑ پر چلے گئے تھے ۔ دماغ
پر اثر کچھ ایسا پڑا کہ نسیان کامل ہو گیا تھا ۔ لوگ کہتے ہیں کہ اپنا نام تک بھول گئے تھے ۔ کچھ
اور یاد ہی نہیں رہ گیا تھا ، بجز قرآن مجید کی کسی چھوٹی سورت کے (غالباً سورہ قل ھو اللہ کے)
بہر حال ان کے پختہ اور سچے ایمان کی شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ۔

قریب دو مہینے کے میں صاحبزادہ صاحب کی ماتحتی میں کانفرنس کا لٹریری اسسٹنٹ رہا ۔
یہ ملازمت جولائی اگست ۱۹۱۶ء تک رہی کھلے دل سے شہادت دیتا ہوں کہ اس مدت بھر ان
مرحوم کی طرف سے شفقت و شرافت و مروت ہی کا برتاؤ رہا ۔ غفلت اور بے اطاعتی یا پھر امانت
و دیانت میں جو بھی کوتاہیاں ہوئیں وہ میری ہی طرف سے ہوئیں ۔ اللہ اس کا بھی پورا اجر موصوف
کو عطا فرمائے ۔ اس کے بعد ایک دور ایسا آیا جس میں میں نے صاحبزادہ صاحب کے خلاف مضمون لکھے
ان مضمونوں میں میں ہی بے جائیت پر تھا ۔ مرحوم کی روح سے معافی مانگتا ہوں ۔ اللہ اس موقع پر صبر کا اجر
مرحوم کو پوری طرح عطا کرے اور مجھ کو بھی معاف فرمائے ۔

راشد الخیری

(متوفی ۱۹۳۶ء)

ٹریجڈی یا غم نگاری کے بادشاہ تھے، میں نے جب دہلی جا کر دیکھا تو سن سفید ہو چکے تھے۔ پھر بھی ہاتھ پیر کے، ڈیل ڈول کے اچھے خاصے تھے۔ جوانی میں ڈنڈ پیل کسرتی رہے ہوں گے۔ پرانی تصویروں کا کینڈا کہے دیتا تھا۔

نذیر احمد مترجم القرآن ان کے عزیز قریب تھے، شاید ان کی بیوی کے یہ بھتیجے تھے۔ زبان سیکھنے کے لئے دہلی سے کہیں باہر جانا نہ تھا اور دہلی میں بھی محلہ کوچہ چیلان (چیلان، میں "ن" کو دبا کر نہ پڑھیے۔ یہ نٓ جمع کی علامت "چیل" کی نہیں "چیلے" کی ہے) اپنی ذاتی صلاحیت اس پر نذیر احمد کی صحبت، سونے پر سہاگہ، یہ بھی چل نکلے۔ اور پھر لکھوانے والے، بہلانے والے، پھسلانے والے ملّا واحدی "چل نکلے"، نہیں، اُڑ چلے، نشہ سہ آتشہ ہو گیا۔ پہلے کچھ افسانے لکھ لکھا، رسالوں میں چھپوائے، پھر ناول تابڑ توڑ لکھنے شروع کر دیے۔ جوہر قدامت، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی نوحۂ زندگی وغیرہ۔ پبلک نے قدر دانی کی، یہ جام پر جام چڑھاتے چلے گئے ؎

ساقی جو دیے جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا
تو میں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا

تعلیم نسواں کے ابتدائی گنہگاروں میں تھے۔ بڑے ٹھسّے سے ماہنامہ عصمت نکالا۔ چلے تھے شرافت کا درس دینے، اسلامیت کو از سر زندہ کرنے، دیکھتے ہی دیکھتے بات قابو سے باہر ہو گئی حجاب و عصمت نہیں۔ تبرج، بے حجابی، فسق، عریانی ہی مقصود بن گئی۔ اور جو کل تک آگے بڑھنے والا تھا، راہ دکھانے والا تھا۔ اس کا شمار رجعت پسندوں میں قدامت پرستوں میں ہونے لگا۔

اور یہی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔

دین کی خدمت کوئی تفسیر و حدیث کی راہ سے کرتا ہے، کوئی کلام و مناظرے کے راستے سے۔ راشد الخیری کی فسانہ نگاری بجائے خود ایک عبادت تھی اور ان کا "جھوٹ"، تمام تر سچ ہی تھا۔ عجب کیا جو ان کی مغفرت کے لیے ان کے ناولوں کے چند ہی ورق کافی ہو گئے ہوں۔ ہر ناول کا ماحصل یہی نکلتا تھا کہ آخرت کی یاد تازہ کر دیں۔ اور پڑھنے والے کو خوف خدا سے رلا چھوڑیں ــــ ۱۹۱۸ء تھا اور میرے اوپر الحاد و بے دینی کا عفریت سوار تھا اور بڑے سے بڑے طبعی صدمے کو بھی دل کی کمزوری ہی سمجھتا تھا۔ ایک روز کیا ہوا کہ شب زندگی پڑھنے کو لے بیٹھا۔ شروع کرنا تھا کہ معلوم ہوا سوتا پھوٹ پڑا، صبر کا زعم، ضبط کا غرّہ ٹوٹ گیا۔ بڑی خیر ہو گئی کہ کمرے کے اندر کوئی اور نہ تھا۔ بڑی شرم اس کی تھی کہ اس غم زدگی کی حالت میں کوئی دیکھ نہ لے۔ غم ناکی اور اثر انگیزی اس بلا کی کہ سطر سطر پر طبیعت آخرت کے لیے گرمائے ــــ بڑے سے بڑے واعظ اور اہل دل کی صحبت میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ طبیعت کا سوز و گداز بڑھ جاتا ہے۔

۱۹۲۴ء کی آخری سہ ماہی تھی مولانا محمد علی کا کامریڈ اور ہمدرد دونوں محمد علی کی ادارت میں کوچہ چیلان سے دوبارہ نکلنے شروع ہو گئے۔ واحدی صاحب کا دفتر چند قدم پر تھا۔ راشد الخیری سے وہیں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ وہیں اکثر آتے رہتے اور کبھی کبھی تو مولانا محمد علی کے ہاں بھی آجاتے۔ مولانا ان کی بڑی قدر کرتے، اور نام رکھ دینے میں تو انھیں ملکہ تھا ہی، اُن کا نام "دُکھیا" رکھ دیا تھا۔

میرا اس وقت سے ۱۹۲۶ء کے شروع تک دہلی جانا اور راشد الخیری سے ملنا ملانا ہوتا رہا۔ بلکہ ایک آدھ مرتبہ تو ان کے ہاں دعوت بھی کھائی۔ اپنے مدرسے (مدرسۃ البنات) میں لیے منہمک و مطمئن رہتے، گویا اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہو۔ اور اسکول کی لڑکیوں کو اپنی ہی بچیاں سمجھتے۔ وہ خود بھی اور ان کی بیگم صاحبہ بھی ــــ خوش اطوار، خوش مزاج، رقیق القلب، رحمدل، ہمدرد، متواضع، سادگی پسند، اور تمکنت سے خالی انسان تھے۔ قلم سے جو لکھتے تھے، وہی دل میں

بھی رکھتے تھے۔ جو راستہ دوسروں کو دکھاتے، اس پر خود بھی گامزن تھے۔ تحریریں دل کے تقاضے سے تحریر کرتے، آرٹ کی نمائش مقصود نہ ہوتی۔ صاحبِ قال نہ تھے، صاحبِ حال تھے رومیِ روشن ضمیر (کاروانِ عشق و مستی کے امیر) نے اخلاق و تہذیب کے بہترین سبق حکایتؔ افسانے کے ذریعہ سے تو دیے ہیں یہاں تک کہ فحش بیانی سے بھی کام لیا ہے۔ پھر آخر راشد غریب نے کیا قصور کیا، جو کہانیوں اور آپ بیتیوں سے کام حکمت و موعظت کی بزم میں لیا۔ اور "حدیث دیگراں" میں "سرِ دلبراں" کو سمو دیا؟ کمال در کمال یہ کہ ان کی بیان کی ہوئی داستانیں اتنی صاف ستھری، شریفانہ، دلچسپ اور دل آویز ہوتیں کہ کیا بوڑھے کیا جوان، کیا لڑکے، کیا لڑکیاں کیا مرد کیا عورتیں، سب ہی ان کو سنتے اور سب ہی کو یہ سناتے۔ قابلِ فخر و نازش ہے اُردو زبان کہ اُسے راشد الخیری سا عبرت آموز درد مند اہلِ قلم نصیب ہوا!

دو گنجِ مخفی

(متوفی (۱) سنہ ۱۹۲۶ء (۲) سنہ ۱۹۲۷ء)

زندگی میں دو ایسے بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو واقعی بزرگ ہی تھے، مگر بظاہر دنیادار۔ کم کسی کا ذہن ادھر منتقل ہوتا کہ یہ بھی کوئی بزرگ اللہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

ایک کا نام تھا مولوی عبد الاحد کاکوری (لکھنؤ) سے متصل قصبہ کسمنڈی کے رہنے والے کلکٹری کچہری میں نقل نویس تھے۔ قلیل تنخواہ پر گزر کرنے والے، اور ہر طرح خوش و مطمئن رہنے والے، جلد کا رنگ یونہی سیاہ تھا، ان کی بدپرہیزی نے اور بھی خون کو جلا بھنا کر رکھ دیا تھا۔ مرچ بڑی کثرت سے کھاتے، چائے اس سے بھی بڑھ کر پیتے۔ مرچیں جیب میں بھری رہتیں اور چائے کی پیالیوں کا دن رات میں کوئی شمار ہی نہ تھا۔ ایک رسالہ منظوم اوصاف چائے میں "چائے نامہ" بھی کبھی لکھا تھا۔ بس شوق سے کھانے پینے کی کل یہی دو چیزیں تھیں، اُن کا بس چلتا تو سوا ان دو کے کوئی چیز نہ کھاتے نہ پیتے۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے، ہر وقت آنکھیں چڑھی سی رہتی تھیں۔ اور ان کے کان اور آنکھیں بزم سماع کے دیکھنے کی مشتاق اور ان کی آواز کی منتظر رہتیں۔ نماز اس عشق سماع کے باوجود ایک وقت کی بھی نہ چھوٹتی۔ بنگال کی طرف کے کوئی بزرگ تھے، شاید ان کے مُرید تھے، عرسوں کے شیدائی تھے۔ بڑے سے چھوٹے تک کوئی بغیر شریک ہوئے نہ چھوڑتے، خدا معلوم اُنھیں چھٹی اتنی کہاں مل جاتی، اور ٹکٹ کے لئے اتنا پیسہ کہاں سے نکل آتا!

ہر حال میں خوش رہتے۔ اپنی کھال میں مست۔ جہاں پایا پڑ رہے، جہاں بھی جگہ مل جائے، بیٹھ گئے یا لیٹ گئے۔ ایک بار میں لکھنؤ میں تھا کہ بیوی دریاباد میں سخت علیل ہوئیں

خبر پاتے ہی میں پہلی گاڑی سے دریاباد کے لئے روانہ ہو گیا، مگر لکھنؤ کچہری کلکٹری میں ان سے ملتے ہوئے جانا نہ بھولا، یہ ملے نہیں، رقعہ لکھ کر ان کے نام چھوڑ آیا کہ "خود تو دریاباد بھاگا ہوا جا رہا ہوں، اب آپ جانیے اور آپ کے اللہ میاں، کہہ سن کر میری بیوی کی دوبارہ زندگی دلوائیے۔" گھر پہنچا تو بیوی کو پورا افاقہ ہو چکا تھا۔

لکھنؤ ایک دفعہ رات کے وقت ملنے آئے۔ کوٹھے کا زینہ اور دروازہ پست اور تنگ تھا۔ بولے کہ "بالکل پل صراط ہے" میں نے عرض کیا کہ "صراط اگر ایسا ہی آسان ہو تو کیا کہنا" بولے کہ "اس سے کہیں زیادہ آسان انشاء اللہ ہوگا۔" میں نے کہا "اچھا تو آج کی بات یاد رکھیے گا، کہیں بھول نہ جائیے گا۔"

سفر میں کہیں جا رہے تھے کہ تپ شدید میں مبتلا ہوئے۔ دہلی اسٹیشن پر اتفاق سے رفیق قدیم حاجی محمد شفیع بجنوری مل گئے۔ وہیں اتار لیے گئے۔ مٹی وہیں کی لکھی ہوئی تھی، قبرستان خواجہ باقی باللہ میں جگہ پائی۔

دوسرے بزرگ قصبۂ فتحپور (ضلع بارہ بنکی) کے شریف خوش باش مولوی عابد حسین تھے۔ ظاہر محض ایک شریف خوش باش قصباتی۔ وضع قطع میں کوئی ایسی چیز آس پاس نہیں جس سے مولوی یا درویش ہونے کا گمان ہو۔ اصل جوہر کچھ عرصے کے سابقے کے بعد ہی کھلتے، نرمی اور ٹھنڈک سے نصیحت کر کے خدا معلوم کتنے بے نمازیوں کو نمازی اور بے فکروں کو مرد مومن اور مذہبی بنا دیا۔ انکسار اور تواضع بدرجۂ غایت تھا۔ اور اپنے کو ہر موقع پر سب سے پیچھے ہی رکھتے۔ رات کو جب سب سو جاتے، نماز کے لئے اٹھتے۔ اور روایت یہ بھی سننے میں آئی کہ برادری میں جب کسی تقریب سے کھانا تقسیم ہوتا، تو پہلے کھانا نکلنے کے اہتمام میں لگے رہتے پھر کچھ دور آگے چل کر نائی یا حمال سے لے کھانے کا خوان اپنے سر پر رکھ لیتے۔ اور عجیب و غریب قصے ان کی ایسی ہی خفیہ خدمت گزاریوں کے اسی طرح کے مشہور رہیں۔

زیادہ شہرت کبھی حاصل نہیں ہوئی، لیکن اپنے محدود حلقے کے اندر خاصے مشہور تھے، خود متبع

مسلک سُنت تھے۔ بدعات سے دور، لیکن بدعت پر کسی سے لڑنا جھگڑنا کیا، تیز ہو کر بحث و مباحثہ کرنا بھی نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان کی زندگی سے خاصے سبق لیے۔ تواضع و انکسار کے تو بادشاہ تھے۔ نماز خود نہ پڑھاتے، امامت کے لیے کسی کو بھی آگے بڑھا دیتے۔ جس دن انتقال کیا، اسی شب میں زلزلہ آیا۔ یہ محض اتفاق سے ہوا ہوگا۔ لیکن خوش عقیدہ گروہ کو اس سے ان کی بزرگی کی سند ہاتھ آگئی۔

راجہ صاحب

(متوفی سنہ ۱۹۳۱ء)

ابھی بچپن ہی تھا اور سیتاپور اسکول کے کسی نیچے درجے میں تھا کہ ولی عہد صاحب محمود آباد سیتاپور آئے۔ اور اپنی اسی کوٹھی میں ٹھہرے، جس میں والد ماجد کرایہ پر رہتے تھے۔ اس کوٹھی کے دو کمرے راجہ صاحب کے لئے مخصوص رہتے تھے۔ کہ اتفاق سے اگر کبھی آجائیں تو وہیں فروکش ہوں۔ راجہ صاحب اسوقت تک ان کے والد امیر حسن خاں تھے، خاں بہادر، راجہ وغیرہ خطابات انگریزی تھے اور امیر الدولہ سعید الملک وغیرہ پرانے خطابات نوابی زمانے کے، ولیعہد کا نام علی محمد خاں تھا، بعد کو راجہ ہوئے اور بہت بعد کو مہاراجہ۔

مذہب ان کا امامیہ تھا، لیکن نسلاً یہ لوگ شیخ صدیقی تھے، حضرت خلیفۂ اول کی اولاد، اور انھیں شیعیت اختیار کئے ابھی دو ہی چار پشتیں ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں سے کوئی خاص قرابت تو نہ تھی، لیکن برادری کے تھے، اور اس قابل سمجھے جاتے کہ ہمارے ان کے رشتہ ہوسکے۔ ضلع کے سب سے بڑے تعلقدار تھے، ہندو مسلمان سب ان کو اپنا بڑا مانتے۔ اور انگریز حاکم بھی ان کی بڑائی کا لوہا مانتے۔ ولی عہد مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے ——— کون جانتا تھا کہ ان سے اتنا لمبا سابقہ تقدیر میں لکھا ہوا ہے!

یہی ولی عہد راجہ ہوکر ایک دن پھر سیتاپور رات گئے پہنچے۔ ریل کے سوا اس وقت موٹر وغیرہ کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ پہنچے اور ذرا پریشانی کے ساتھ، خدا معلوم ساتھ کے ناشتے وغیرہ پر کیا اُفتاد پڑی کہ پیچھے چھوٹ گیا تھا اور راجہ بھوکے تھے۔ سیتاپور کوئی بڑا شہر تھا نہیں کہ بڑے بڑے ہوٹل ہوتے، دو ایک ٹٹ پونجیے سے تھے بھی، وہ بھی بند ہوچکے تھے۔ ساتھ میں دو ایک

مصاحب اور دو ایک خدمتگار تھے، کھانا رات کا ہمارے ہاں بھی ہو چکا تھا اور میں تو خود سو ہی چکا تھا۔ نماز عشا کے بعد لیٹنے کی تیاریاں گھر بھر کی تھیں۔ راجہ صاحب کے نام کا غلغلہ سُنکر سب چونک اٹھے اور گھر میں یہ داستان غریب سُن کر ایک کھلبلی مچ گئی ـــــ گھر میں مرغیاں پلی ہوئی تھیں، انڈے جلدی جلدی تل دیے گئے۔ گھر میں بھینس بھی پلی ہوئی تھی، دودھ، دہی، گھی سب گھر میں موجود تھا فرینی بھی اسی دودھ کی تیار ہوگئی۔ غرض غریبا مئو ساماں چٹ پٹ کھانے پینے کا ہو گیا۔ راجہ صاحب اس دعوت شیراز سے بہت خوش ہوئے اور برسوں تک اسے یاد رکھا۔ اس وقت تو میں سو گیا تھا صبح اُٹھ کر یہ قصہ سُنا۔

لکھنؤ میں کالج میں پڑھنے میں جولائی ۱۹۰۸ء میں آیا اور قیصر باغ میں والد ماجد کے ملنے والے چودھری نصرت علی سندیلوی کی کوٹھی ۸ میں مقیم ہوا۔ راجہ صاحب بھی اسی قیصر باغ کے مغربی سمت کی لق و دق عمارت میں محمود آباد ہاؤس کے نام سے متمکن و متصرف تھے۔ صدر دروازے پر چوبیسوں گھنٹے گورکھا سنتری بندوقچی پہرہ دار۔

شروع میں تو خیر کم لیکن ۱۹۱۰ء ۱۹۱۱ء سے زرا جلدی جلدی پھیرے ہونے لگے، خود راجہ صاحب سے تو کم، لیکن ان کے مہمانوں سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی، مہمان خانہ تھا محل کسی اعلےٰ ہوٹل کی ٹکر کا، جب دیکھیے تو معزز مہمانوں سے بھرا ہوا اور کبھی کبھی بڑے اونچے مہمانوں سے بھی۔ کبھی کبھی کوئی صاحب (مثلاً سابق جسٹس سید کرامت حسین) مستقل قیام پذیر ہو جاتے۔ ریاست کے مینجر (پہلے "نائب" کہلاتے تھے) مسٹر حبیب اللہ صاحب سیدن پوری بھی اسی کے ایک حصے میں رہتے (ان کے بہت ضعیف العمر والد صاحب شیخ عنایت اللہ صاحب مرحوم اسی عہدے پر تھے) یہ بھی میرے والد مرحوم کے پرانے ملنے والے اور میرے اوپر بھی بہت ہی مہربان۔ اور بجز اپنے رنگ کے اپنی ہر چیز میں "صاحب بہادر۔"

راجہ صاحب کے سیاسی شغلے بے انتہا تھے، وہ ہر پارٹی کے ایک پر جوش کارکن ہو جاتے

تھے یشروع شروع میں مسلمانوں کو کونسلوں وغیرہ میں الگ حق نمایندگی ملا ہے، تو وہ اس کے زبردست حامی بلکہ داعی تھے۔ بعض دفعہ کام سُنّی علما سے لینا پڑتا اور اُس وقت راجہ والد مرحوم کو ساتھ لے کر فرنگی محل جایا کرتے۔ راجہ کی دلچسپیاں بیشمار تھیں اور خصوصاً علی گڑھ کی زیرِ تعمیر یونیورسٹی کے سلسلے میں۔ سر آغا خاں دھوم دھام سے لکھنؤ انھیں کے مہمان ہوئے۔ اور ان آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھ لیا کہ ایک پشتینی رئیس اپنے سے بڑے رئیس کی دعوت مہمان داری میں کیسا دوڑا دوڑا پھرتا ہے! ـــــــ دعوتِ عام کے موقع پر جو سفید بارہ دری (قیصر باغ) میں ہوئی تھی، اس میں کھانے ایک ایک کے سامنے اتنی تعداد میں لگے ہوئے تھے کہ کھانے والے کا ہاتھ ہر کھانے تک پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کھانے کی روزمرہ صورت راجہ کے ہاں یہ ہوتی کہ کھانا اس ڈائننگ روم میں کھاتے جس سے یہ کام ڈرائنگ روم کا بھی لیتے۔ جو آتا بڑی لمبی سی میز پر بیٹھ جاتا اور کھانا بھی اسی میز پر اس کے سامنے لگ جاتا۔ ہر وقت کھانے آٹھ دس قسم کے کھانوں سے کم کیا ہوتے۔ مثلاً قورمہ، قلیہ، دو قسم کے کباب، پلاؤ، بالائی تلاتند، مُرّبے وغیرہ۔ تنوع و تعداد کے علاوہ کثرت و افراط بھی ہر کھانے کی۔ بالائی آتی تو طباقوں میں، آم آتے ٹوکروں میں، غرض ریل پیل ہر چیز کی ہوتی!

موٹریں جب تک نہیں چلی تھیں گھوڑا گاڑیوں کی بہار تھی، لینڈو گاڑیوں میں جوڑیاں ان کے ہاں بھی تھیں محمود آباد کی جوڑیوں پر لکھنؤ بھر کی نظر پڑتی۔ پھر جب موٹریں چلیں تو موٹریں ہی موٹریں تھیں۔ اخیر عمر میں خیال ایسا پڑتا ہے کہ نو نو موٹریں تھیں۔ والد ماجد جب اکتوبر ۱۹۱۲ء میں حج کو جانے لگے تو موٹریں تو اس وقت تک تھیں نہیں۔ راجہ صاحب کے خاصے کی گاڑی تھی وہی اسٹیشن پہنچانے آئی۔ والد صاحب نے رخصتی ملاقات میں مجھے خاص طور پر ملوایا، والد ماجد کا حج ہی میں انتقال ہوگیا۔ اب میری تعلیم کی کیا صورت ممکن تھی؟ خرچہ جو کچھ چلتا تھا وہ ان کی پنشن سے اور وہ اب بند ہوگئی۔ میں تعلیم علی گڑھ میں ایم اے میں پا رہا تھا اور کچھ اوپر پورا ایک سال ابھی باقی تھا۔ تعلیم کا مسئلہ اب سخت مشکل تھا۔ راجہ صاحب کے پاس بھائی صاحب والد مرحوم

کے انتقال کی خبر پہنچانے گئے تو راجہ صاحب نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ ان کی تعلیم ہرگز بند نہ کیجیے، میں پڑھاؤں گا اور پھر میرا تعلیمی بجٹ پوچھ کر، اور ۳۵ روپیہ ماہوار کے بجائے ۵۰ روپیہ ماہوار رکھ کر اور بجائے ۱۲ مہینے کے ۱۶ مہینے کا حساب لگا کر پورے ۸۰۰ کی رقم بنک میں میرے نام جمع کرا دی ——— یہ آٹھ سو کی رقم یاد رکھیے ۱۹۱۴ء میں تھی۔ ۱۹۷۳ء کے حساب سے ۱۲ ہزار سے کم نہیں ہوتی۔!

اس طرح کا لطف و کرم میرے اوپر غیر منقطع و مسلسل رہا۔ رسالہ معارف دار المصنفین کے لئے میں نے زبان کھولی (غالباً ۱۹۱۶ء) تو ایک معقول رقم دے دی۔ ایک فرنگی محلی خاندان کی بیوہ خاتون کی لڑکی کی شادی کا میں نے ذکر کیا، ان کے پاس بھی ایک معقول رقم بھجوا دی، ملی چندوں کا علی گڑھ سے لے کر مقامی اسکولوں تک کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ سُن سُن کر بس حیرت ہی ہو جاتی۔ جون ۱۹۱۶ء میں میری شادی ہوئی لکھنؤ سے دریاباد کے لئے دُلہن لانے کو موٹر خاص اپنی سواری کی دی۔

شیعیت یا امامیت محمود آباد خاص میں جو کچھ بھی معلوم ہوتی ہو، لکھنؤ کے محمود آباد ہاؤس میں تو اس کا نشان بھی نہ تھا۔ ریاست کے نائب یا منیجر ان کی زندگی بھر سُنّی ہی رہے۔ اسسٹنٹ منیجر اور منصرم اور تحصیلداروں اور مختاروں میں عموماً سُنّی ہی رہے۔ ۱۹۱۵ء میں مجھے تلاش ملازمت تھی، خود امپیریل کونسل کے ممبر کی حیثیت سے شملہ پر تھے، وہیں مجھے بلا بھیجا کئی دن تک مہمان رکھا اور اعلیٰ افسروں سے میری سفارش کی۔ کامیابی نہ ہوئی۔ پھر لکھنؤ میں بھی ایک اچھے تعلیمی عہدے (انسپکٹر آف مسلم اسکولز) کے لئے میری سفارش سر جیمس مسٹن (لفٹننٹ گورنر) سے کی۔ یہ اور بات ہے کہ کامیابی اب کی بھی نہ ہوئی۔

فیاض، مہمان نواز، شریف پرور، خرد نواز، متواضع، منکسر ہونے میں اپنی مثال آپ تھے۔

سابقہ میں ادائے حقوق میں کمی اور کوتاہی میری ہی طرف سے بار بار ہوتی رہی، ہر بار

اپنی عالی ظرفی سے معاف ہی کرتے رہے۔ اللہ انھیں بھی معاف فرمائے۔

۱۹۳۱ء میں جب محمود آباد میں دفعتاً انتقال کیا، تو میں نے ایسے محسن کی مغفرت کے لئے دل سے دعا کی۔ اور برسوں بعد جب قبر پہ جانا ہوا تو اس وقت بھی دل اُن کے احسانات کے بار سے بھرا ہوا تھا۔

اکبر یار جنگ

(متوفی ۱۹۵۹ء)

اپنے قیام حیدر آباد کے زمانے میں (ستمبر ۱۹۱۷ء تا جولائی ۱۹۱۸ء) ایک بڑے نامور وکیل غلام اکبر خاں تھے، تعارف ہوا۔ اس کے بعد وہ حیدر آباد ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ اور پھر ہوم سکریٹری کے بھی معزز عہدے پر رہے، خیال نہیں پڑتا کہ کس نے ملایا اور کس تقریب میں، بہرحال مجھ سے تعارف ہوا اور تعلقات خاصے بڑھ گئے۔

آدمی بڑے مضبوط ارادے کے تھے۔ بات کے پکّے، وعدے کے سچے، شریف بامروّت مہمان نواز، وضعدار۔ یو۔ پی کے فرخ آباد یا قائم گنج کے رہنے والے۔ اغلباً ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی برادری کے۔ سوا اسکے کہ آبائی مذہب اہل سنت کو چھوڑ کر ان کے والد قادیانی یا احمدی ہو گئے تھے۔ باقی ہر حیثیت سے نیک نام تھے۔ دیندار اور علاوہ حقوق اللہ کی ادائی کے حقوق العباد کے ادا کرنے میں بھی مستعد اور چوکس۔ میں جب ۱۹۲۹ء میں حج کو جانے لگا تو حیدر آباد بھی عزیزوں سے ملنے گیا۔ ان سے بھی ملا۔ مجھے الگ بُلا کر لے گئے۔ اور بالکل تنہائی میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ "خانہ کعبہ میں میرے حق میں دعا کیجئے گا خاص کر اس کی کہ اگر میں غلطی میں پڑ گیا ہوں تو اللہ مجھے اس سے نجات دے" میں اس اخلاص پر دنگ رہ گیا۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی (غالباً ۱۹۳۸ء میں) تو میں نے مل کر شکایت کی کہ آپ کے فرقے کے فلاں صاحب بڑے تکلیف دہ ہیں، خواہ مخواہ مناظرے کے لئے ہر چھوٹے بڑے کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ اس شکایت کا اچھا اثر ہوا۔ آخر عمر میں جب بہت ضعیف ہو چکے تھے، غالباً ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے

ایک جید عالم مولانا محمود حسن خاں ٹونکی (صاحب معجم المصنفین) کو اپنے ہاں مستقل مہمان ٹھہرا رکھا تھا۔ اور ان سے مناظرہ تحریری، عقائد احمدیت پر کیا کرتے۔ یقیناً فریقین کے وہ پرچے بڑے دلچسپ اور سبق آموز ہوں گے، اور مناظرہ بلا اشتعال انگیزی اور سخت کلامی کی واحد مثال۔ ان مولانا کے لڑکے عثمانیہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔ اب پنشن پر چلے گئے ہیں۔ کاش ان کے پاس وہ اوراق نکل آئیں۔ اگر ان کے پاس نہ ہوں، تو نواب مرحوم کے وارث اپنے ہاں کے کاغذات میں تلاش کریں۔

(متوفی ۱۹۲۶ء)

شرر صاحب کے نام سے کان بچپن سے آشنا ہو گئے تھے اور اردو کی شُدبُد ابھی ہو رہی تھی کہ شرر کے ناول نظر سے گذرنے لگے۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع کا زمانہ شرر کے اوج شہرت کا زمانہ تھا۔ ان کے ناول اور ان کے مضمون ۱۵، ۲۰ سال قبل سے نکل رہے تھے۔ ان کے ماہنامے "دلگداز" کی اشاعت غالباً ۱۸۸۷ء سے تھی۔

پہلی بار دور سے زیارت لکھنؤ میں سٹی اسٹیشن پر غالباً ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ سے ان سے اس وقت خوب چلی ہوئی تھی۔ اور اودھ پنچ نے اپنے رنگ خصوصی جکبست کی مدد سے کوئی دقیقہ مولانا کی تضحیک و تفضیح کا اٹھا نہیں رکھا تھا ــــــ قریب سے زیارت کئی سال بعد ۱۹۱۱ء میں ایک طبی کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی اور تعارف کا موقع بھی اسی ذیل میں حاصل ہو گیا ــــــ تعارف ایک پختہ کار ادیب و انشاء پرداز اور ایک نوعمر طالب علم اور نومشق مضمون نگار کے درمیان جو ابھی بی اے کے آخری سال میں تھا!

شرر مرحوم اس وقت بھی بڑے لطف و کرم سے پیش آئے، جیسے میں کوئی ان کے برابر کا تھا! ۱۹۱۲ء میں وہ مولانا محمد علی کے نئے روزنامہ ہمدرد کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے دہلی گئے اور جانے سے قبل خوب مفصل ملاقاتیں رہیں، لیکن جلد ہی واپس آ گئے ــــــ جو باورچی دیگ اچھی پکاتا ہے، کیا ضرور ہے کہ ہانڈی بھی خوب پکائے؟ اچھے ناول نویس اور انشاء پرداز کے لئے یہ کیا ضرور ہے کہ ایک روزنامے کا ایڈیٹر بھی کامیاب ثابت ہو؟ ــــ

فردوس بریں ہو جس میں اس فرقۂ زنادقۂ باطنیہ کی پوری سرگذشت آگئی ہے یا مقدس نازنین

ہو جو ایک ہزار سال قبل کے مسیحیوں خصوصاً کیتھولک فرقہ والوں کی زندگی کا آئینہ ہے، یا حسن انجلینا ہو یا ملک العزیز ورجنا ہو یا منصور موہنا ہو، جو تاریخ اسلامی کے مختلف دوروں کے ترجمان ہیں، تو ان کے مصنف کی قابلیت و جامعیت کی بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے اور اس کے حق میں دعائے خیر بے اختیار دل سے نکلتی ہے —— آج بازار میں شرر صاحب کا نام ماند پڑ گیا ہے، کل، "حشر والے کل" سے قبل ہی انشاء اللہ اسی دنیا میں پھر ابھرے گا، جس وقت مسلمان اپنے خادموں کی تاریخ مرتب کرنا شروع کرینگے۔

ناول نویسی کے علاوہ شرر مرحوم کا مرتبہ مضمون نگار اور انشا پرداز کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے عنوان سے جو مسلسل مضامین ان کے قلم سے لکھنؤ کے تہذیب و تمدن پر نکلے وہ عجب نہیں کہ مدتوں زندہ رہیں۔ اور آئندہ مورخین و اہل تحقیق برابر ان سے خوشہ چینی کرتے رہیں۔

دلگداز بار بار نکلا اور بند ہوا۔ اپنے زمانے میں ملک کے ادبی رسالوں کا سر و دم دار تھا۔ شرر مرحوم بھی حیدر آباد بار بار بلائے گئے، اور واپس کیے گئے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں میرے زمانۂ قیام حیدر آباد میں غالباً آخری بار بلائے گئے، اور چند ہی ماہ بعد واپس ہوئے۔ وہ زمانہ میرے خاص ابتلا کا تھا۔ مخالفین کا ہجوم شدت سے تھا۔ الزام الحاد کا تھا اور ٹھیک تھا، لیکن مخالفین اس کی آڑ لے کر حد سے تجاوز کر رہے تھے۔ شرر صاحب ایک طرف اپنی مذہبیت پر قائم رہے، دوسری طرف مجھے برابر مخلصانہ اور مفید مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔

لوگ شرر اور سرشار کے درمیان موازنہ اور محاکمہ خواہ مخواہ کیا کرتے ہیں۔ جیسے دونوں ایک راہ کے مسافر ہوں! حالانکہ دونوں کے رنگ ہی بالکل الگ الگ تھے۔ لکھنؤ کی بول چال سیکھنا اور لکھنؤ کی زندگی اندر سے دیکھنا ہو، خصوصاً رندمشربوں اور بے فکروں اور بگڑے ہوئے نوابوں اور نواب زادوں کو جاننا پہچاننا، تو بے شک سرشار کو پڑھیے۔ سرشار اس فن کے امام ہیں۔ شرر صاحب کی راہ بالکل دوسری ہے۔ تاریخ امم خصوصاً تاریخ امت کو اگر جاننا ہو اور مسیحیت کی تاریخ سے اگر واقفیت کامل حاصل کرنا ہو، تو شرر صاحب کی تاریخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

چودھری محمد علی رُدَولوی

(متوفی ۱۹۵۹ء)

کمال اور شہرت لازم و ملزوم نہیں، شہرت کے اسباب ہی کچھ اور ہوتے ہیں، کچھ داخلی اور اختیاری، کچھ خارجی اور غیر اختیاری۔ کتنے باکمال ایسے ہیں، جو شہرت سے یکسر محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ شعر و ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ انھیں میں ایک مثال چودھری محمد علی کی ہے۔ بڑی پیاری زبان لکھنے والے، مگر گمنامی میں پڑے ہوئے۔ ایک نہیں، کئی ایک چھوٹی بڑی کتابوں کے مُصنف، مگر سب گمنامی میں پڑی ہوئی۔ اتنی شستہ، سلیس، بامحاورہ نستعلیق زبان کم ہی لوگ لکھ سکتے ہیں۔

ذاتی زندگی میں بڑے ہی زندہ دل، ظریف، دِل لگی باز تھے۔ روتے ہوؤں کو ہنسا دینے والے۔ ہر موضوع پر بہترین گفتگو کرنے والے تھے۔ اور ان کی انشاپردازی لفاظی کے مرادف نہ تھی، اچھے خاصے پڑھے لکھے، صاحب علم و معلومات تھے۔ انگریزی ادب و علوم کا مطالعہ اچھا خاصا وسیع۔ کالون تعلقدار اسکول لکھنؤ کے پڑھے ہوئے۔ لہجہ و تلفظ انگریز استادوں سے سیکھے ہوئے۔

مولانا ابو الکلام آزاد صاحب الہلال ایک بار غالباً ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ آئے اور غریب خانے پر کھانے تشریف لائے۔ اس وقت شہرت یہی تھی کہ ان سے گفتگو میں کوئی شخص ٹھہر نہیں سکتا اور وہ اپنے ہر مخاطب کو بنا ڈالتے ہیں۔ "مقابلے" کے لیے چودھری صاحب ڈھونڈ نکالے گئے، اور کھانے پر جب گفتگو چھڑی، اور لطائف و ظرافت کی بازی لڑی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جوڑ برابر کی ہے۔

آبائی مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھے، اپنی تحقیق اور ادراک سے اُس سے ہٹ آئے۔ اور گو سُنّی نہیں ہوئے لیکن شیعیت پر بھی قائم نہیں رہے۔ ایک کتاب میرا مذہب کے نام سے لکھ دی ہے۔ اس میں اپنے کو شیعہ و سُنّی کی تفریق سے بالاتر دکھایا ہے ـــــــ ایک اور ان کے ہم مسلک اسکول کے سکنڈ ماسٹر، ماسٹر ابو البقا جونپوری بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ روایتی شیعیت کو اپنی اختیار کردہ اسلامیت کے ماتحت رکھتے اور جس اسکول میں بھی پہنچتے، اسکول کے مسلمان لڑکوں کو نماز باجماعت کا پابند بنا دیتے۔ اور امام سُنّی ہی لڑکے کو ہو جانے دیتے (شیعہ فقہ میں "پیش نمازی" عہدہ ہے اور اس کے خاص اور سخت شرائط ہیں)

مفسّرِ الفراہیؒ

(متوفی ۱۹۳۰ء)

مولانا حمید الدین الفراہی کا نام نامی سب سے پہلے الندوہ میں نظر پڑا۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں۔ الندوہ کے ایڈیٹر مولانا شبلی تھے اور یہ مولانا کے پھوپھی زاد بھائی تھے، وطن اعظم گڑھ ہی کے ضلع کا موضع "پھریا"، اعظم گڈھ اور شاہ گنج کے درمیان "الفراہی"، "پھریا" ہی کا معرّب تھا۔

اُنھوں نے فارسی شاید مولانا ہی سے پڑھی تھی، بڑے سنجیدہ و مفکر قسم کے آدمی تھے، جو کچھ پڑھا وہ محنت اور شوق دونوں سے پڑھا۔ اس لیے ادبیات فارسی، وعربی میں اپنے معاصرین سے بازی لے گئے۔ اور ممکن ہے کہ مولانا شبلی سے بھی۔ فارسی اور عربی دونوں پر بے تکلف قدرت اہل زبان کی طرح رکھتے تھے۔ فارسی میں شاعرِ صاحبِ دیوان تھے۔ اور عربی میں کلامِ جاہلیت کے گویا حافظ تھے۔ البتہ عربی عبارت بڑی گھٹی ہوئی ہوتی تھی۔ اس لیے مُغلق ہوجاتی تھی اور بیان میں سلاست باقی نہیں رہتی تھی۔ کراچی اور الٰہ آباد میں عربی و فارسی کے اُستاد رہے۔ اور پھر آخر میں برسوں حیدر آباد کے دار العلوم نظامیہ کے صدر یا پرنسپل۔ لکھنؤ میں مولانا شبلی کے ہاں ملاقات ہوئی، آدمی کم سخن و کم آمیز تھے۔ میں اُس وقت مُلحد اور وہ سخت دیندار البتہ ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد میں مہینوں ان کا ساتھ رہا۔ ان کی خوش دماغی اور دقّتِ نظر کے جوہر کھُلے۔ بعض دفعہ شام کی سیر میں ساتھ ہوجاتا تھا۔ ہر مسئلے میں عجیب عجیب نکتہ آفرینیاں کرتے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیادیں پڑ رہی تھیں۔ مجلس وضع مصطلحات میں شریک رہتے اور بحث و مباحثے میں اچھا خاصا حصہ لیتے۔

فلسفے کا مطالعہ بھی مولانا کا خاصا وسیع اور اس سے بھی زیادہ گہرا تھا، ارسطو وغیرہ کے

بڑی دقت نظر سے مطالعہ کے علاوہ جدید ترین مغربی فلسفہ و منطق کی کتابیں بھی پڑھا کرتے، اور محض پڑھ ہی نہ ڈالتے بلکہ خوب اس پر غور و تدبر کرتے اور بحث و تنقید کا سلسلہ جاری رکھتے۔ ۱۹۱۸ء میں میں حیدرآباد سے واپس آگیا۔ اور مولانا بھی مجھ سے بیشتر ہی پنشن کی قلیل رقم پر وہاں سے ریٹائر ہو کر اپنے وطن "پھریا" آگئے تھے۔ سادگی و قناعت ان کی ہمیشہ سے معلوم تھی، لیکن قناعت کے اصل نمونے اب جاکر دیکھنے میں آئے۔ کئی سو کے مشاہرے سے دفعتًا دہائیوں پر آکر ہنسی خوشی گزر کر لینا ہر ایک کا کام نہیں، مولانا نے یہ مجاہدہ آسانی سے طے کر لیا۔

۱۹۱۹ء سے میری آمد و رفت اعظم گڑھ بہ سلسلہ دارُالمُصنّفین شروع ہوئی، مولانا پھریا سے سفر کر کے ضرور آتے اور دو ایک دن یکجائی رہا کرتی۔ مولانا کی عبادت اور مذہبیت قابل دید تھی۔ نماز کی اولیت وقت کا جو اہتمام رکھتے، ایسا اہتمام میں نے ایک ہی جگہ اور دیکھا ہے۔ اور وہ شخصیت حضرت اکبر الٰہ آبادی کی تھی، مولانا خود ہی سرگرم نمازی نہ تھے۔ دوسرے بھی ان کی ہیبت سے نمازی بن جاتے۔ جب تک مولانا کا قیام رہتا، احاطۂ دارالمصنفین کے اندر نماز کا خوب چرچا رہتا۔

لکھنے کی مشق اردو میں نہیں، عربی میں تھی۔ خصوصی موضوع سالہا سال سے قرآن مجید تھا، خصوصًا ادب و بلاغت کے پہلو سے۔ تفسیر میں روایتوں کو بہت کم دخل دیتے۔ اصلًا زور اور تکیہ سیاق آیات پر رکھتے۔

غیرت دینی کے پتلے تھے، مولانا شبلی کبھی کبھی ہنسی میں یا فرط شوخی سے مذہب پر چوٹ کر جاتے، مولانا فراہی کو اس کی ذرا برداشت نہ تھی، سنجیدگی سے جواب میں مقالہ یا رسالہ لکھ ڈالتے، اور جب تک لکھ نہ لیتے، محسوس ایسا کرتے کہ جیسے بخار چڑھ آیا ہو!

اپنے زمانے میں جو کچھ بھی لکھا، عربی میں لکھا، اور قرآن ہی پر لکھا، زبانی بیان اس سے بھی بہتر ہوتا۔ ہر بات سننے والے کی سمجھ میں آجاتی، کہیں نہ تنقید ہوتی نہ اغلاق۔ افسوس کہ اردو لکھنے کی مشق نہ فرمائی۔ اب البتہ بعض لائق شاگردوں نے عربی تحریروں کے عام فہم ترجمے

چھوٹی چھوٹی جلدوں میں شروع کر دیے ہیں۔ بہت سی سورتوں کی تفسیر اُردو میں کی جا چکی ہے۔ ایک مختصر لغت قرآنی بھی چھوڑ گئے ہیں۔ عزیز ترین شاگرد امین احسن اصلاحی پاکستانی اب بحمد اللہ پوری تفسیر قرآن کی اپنے استاد کے قائم کیے ہوئے اصول پر لکھ رہے ہیں۔ دو جلدیں اس وقت تک دیکھنے میں آ چکی ہیں۔

اتنا صابر، اتنا ضابط، اتنا قانع، اتنا متوکّل، اتنا شریف انسان میری نظر سے کم ہی گزرا ہے

مولانا ثناء اللہ امرتسری

(متوفی ۱۹۴۸ء)

موصوف کا نام میں نے اس وقت جانا جب ایک مرتد کی کتاب ترک اسلام سے دل بے حد جلا ہوا تھا، اور مولانا نے اس کا جواب قریبی مدت میں ترک اسلام لکھ ڈالا تھا۔ جواب ترکی بہ ترکی۔ مرتد کی ترکی اسی وقت ختم ہوگئی اور آخر نئے سرے سے اسلام کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ میں اسکول کے چھٹے درجے کا طالب علم تھا اور عمر ۱۱ سال سے زائد نہ تھی، ایک ہندو لڑکے سے لے کر ترک اسلام کی جھلک دیکھ لی تھی، اور اس پر تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی ——— کچھ ہی دن بعد ترک اسلام کی زیارت نصیب ہوگئی اور اس نے زخم پر ٹھنڈا مرہم رکھ دیا۔ یہ ۱۹۰۲ء ہوگا یا ۱۹۰۳ء کا شروع، اور دل مولانا کا اسی وقت سے بےحد معتقد ہوگیا تھا۔ ان کی تحریریں اس اعتقاد کو بڑھاتی ہی رہیں۔ ان کا ہفتہ وار اہل حدیث بھی کچھ دنوں بعد دیکھنا شروع کر دیا۔ اس اعتقادی غلو میں اعتدال و توازن کہیں سالہا سال بعد جاکر پیدا ہوا مولانا کی اردو تفسیر بھی مختصر تفسیروں میں اچھی ہے۔ لیکن عربی تفسیر کا نمبر اس سے بڑھا ہوا ہے۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن ہی سے کی ہے۔ ہم معنی آیتیں خوب یکجا مل جاتی ہیں۔ فن مناظرہ کے تو کہنا چاہیے امام تھے۔ خصوصاً آریہ سماجیوں کے مقابلے میں۔ جو علاوہ بدفہم و بے علم ہونے کے بدزبان بھی ہوتے تھے۔ اور شروع صدی میں ان کا فتنہ اس وقت کا سب سے بڑا تھا۔ اگر مولوی ثناء اللہ ان کے سامنے آنہ جاتے تو مسلمانوں کی مغلوبانہ مرعوبیت خدا جانے کہاں تک پہنچ جاتی!

——— حریف کی ذہنیت کی نبض شناسی میں مولانا بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ایسی بات ڈھونڈ نکالتے کہ آریہ سماجی ذہنیت دنگ ہوکر رہ جاتی۔ اب یاد نہیں کہ کتنے مناظرے کر ڈالے

اور ہر جگہ کامیاب ہی رہتے۔ ایک جگہ ایک معروف نامور آریہ سماجی مناظر نے شروع ہی میں خم ٹھونک کر کہہ دیا کہ "آپ مسلمان ہی کب ہیں جو اسلام کی طرف سے وکیل بن کر آئے ہیں۔ دیکھیے مسلمان علماء کے فتوے، یہ سب آپ کی تکفیریں ہیں"، یہ کہا اور میز پر ان فتووں کا ڈھیر لگا دیا۔ مولانا صبر کے ساتھ اپنی تکفیر کا ڈھنڈورا سنتے رہے۔ جب وہ کہہ چکا، تو کڑک کر بولے "اچھا صاحب۔ میں اب مسلمان ہوتا ہوں، اور آپ سب مسلمان گواہ رہیں کہ میں سب کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھتا ہوں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ! فرمائیے اب تو کوئی عذر باقی نہ رہا"۔ مسلمان باغ باغ ہو گئے۔ آریہ مناظر سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور مولانا نے اپنا کام چلتا کر دیا۔

عیسائیوں سے مقابلہ کے لیے بھی پوری طرح تیار رہتے۔ وہ زمانہ بھی مناظرہ بازیوں کا تھا اور آریہ سماجیوں نے مسلمانوں کے منھ آنا عیسائیوں ہی سے سیکھا تھا۔ عیسائی مشنری انیسویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ عیسائیوں سے مقابلہ کے لیے مولانا نے شُدبُد کچھ انگریزی بھی سیکھ لی تھی، اگر کہیں انگریزی کا مطالعہ زیادہ کر لیا ہوتا تو اپنے فن میں بے مثل ہو جاتے۔ کلمہ گو فرقوں کے اندر توجہ "احمدیہ" (قادیانیہ) پر زیادہ رہتی، بلکہ ایک بار تو ایک انعامی مباحثے میں انعام بھی احمدی فریق سے جیتا تھا۔

کانپور میں دسمبر ۱۹۲۵ء میں خلافت کانفرنس کے موقع پر مولانا سے شخصی نیاز حاصل ہوا، اور پھر کبھی کبھی مراسلت بھی رہی۔ مولانا کا مسلک اہل حدیث کا تھا۔ اور ایک طبقہ ان کو اپنا سرگروہ بھی سمجھتا تھا۔ لیکن عبرت اور حسرت کا مقام ہے کہ مولانا کی تکفیر میں بھی سب سے زیادہ ساعی اہل حدیث ہی حضرات تھے! مولانا کی تعلیم دیوبند (حنفیہ کے گڑھ) میں ہوئی تھی۔

مولانا کے ہفتہ وار پرچے کا نام اہل حدیث تھا کبھی کبھی اس میں اخباری صوفیہ کے سردار خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بھی نوک جھونک رہتی۔

پاکستان بننے سے مولانا امرتسری کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ نقل مکان کرنا پڑا۔

جوان لڑکے کی شہادت کا صدمہ اٹھانا پڑا اور کچھ عرصے کے بعد فالج میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اللہ درجات عالی سے سرفراز فرمائے۔ معلمین اسلام کی بہترین مثال و نظیر اس زمانے میں تھے۔

خواجہ غلام الثقلین

(متوفی ۱۹۱۵ء)

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں پڑھے لکھے مسلمانوں کی سب سے بڑی اور اونچی مجلس علی گڑھ کی محمڈن (نام، مسلم، اس وقت چلا ہوا نہ تھا) ایجوکیشنل کانفرنس اپنے سالانہ جلسے ملک کے کسی بڑے شہر میں ہر سال دسمبر کے اخیر ہفتے میں دھوم دھام سے کیا کرتی، اور خوب تقریریں سننے میں آجاتی تھیں۔ اور اس وقت تک اُمت کے کام بھی گویا یہی دو تھے۔ لیڈروں کے اہل تقریریں کرتے، اور عوام کے اہل تقریریں سنتے اور ان کی داد دیتے۔

اسی کانفرنس کے ایک شعبے کا نام صیغۂ اصلاح تمدن (سوشل ریفارم) تھا اور اس کے سکریٹری خواجہ غلام الثقلین بی، اے ایل ایل بی پانی پت کے رہنے والے، حالیؔ کے عزیز اور علی گڑھ کے بڑے پرجوش اولڈ بوائے۔ شیعہ ہونے پر بھی سُنیّوں سے خوب گھلے ملے رہتے فکر و نظر سطحی نہیں، علمی اور گہرے قسم کی۔ بڑے صاف گو اور مخلص، باتیں کھری کہتے اور ملت کے کام کی۔ اسراف اور تکلفات کے دشمن میرے دل کو اسکول ہی کے زمانے سے ان کی باتیں خوب لگتیں اس وقت لکھنؤ میں وکالت کر رہے تھے۔ گولہ گنج کے ایک چوراہے واقع گوئن روڈ پر ان کی کوٹھی زرد رنگ کی خوب نمایاں تھی۔ ایک ماہ نامہ عصر جدید کے نام سے نکالتے تھے۔ میں ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۶ء سے اس کا خریدار بن گیا۔ اور ایک بار سیتاپور سے لکھنؤ آکر اپنی جھیپ اور شرمیلے پن کے باوجود ان سے آکر خاص طور پر ملا۔ اور پھر بعد کو مراسلت بھی جاری رکھی اور کبھی کبھی ملاقات بھی۔ لکھنؤ سے کچھ روز بعد میرٹھ منتقل ہو گئے ــــ کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو گئے۔ اس سلسلے سے لکھنؤ بھی آنا ہوجاتا تھا۔ بڑے سادہ مزاج وقانع قسم کے آدمی تھے۔ عراق اور ایران جاکر

مقاماتِ مقدسہ کی زیارت بھی کر آئے اور سفرنامہ بھی لکھ کر شائع کیا۔ ان کی امن پسندی اور مصالحت جوئی سے کٹر قسم کے شیعہ سخت ناراض رہا کرتے۔ یہ بھی لکھنؤ میں جب تک رہے بس خاص ہی خاص شیعوں سے ملتے رہے۔ مثلاً مرزا محمد ہادی رسوا، افسوس ہے کہ بچارے کی عمر نے [illegible] ابھی ادھیڑ ہی سن کے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کر گئے۔ لڑکا بڑا ہونہار اور لائق نا تو چھوڑا۔ خواجہ غلام السیدین ولایت سے ڈگریاں لائے۔ اور مرکزی حکومت میں ایجوکیشن سکریٹری کے عہدے پر رہے۔ صاحبزادی بھی صالحہ کے نام سے اسم بامسمیٰ نکلیں، ماشاءاللہ زندہ وسلامت اور صالحہ عابد حسین بن کر اچھے اصلاحی ناول لکھتی رہتی ہیں۔

ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے۔ خواجہ غلام الحسنین وہ بھی انھیں کی طرح، فلسفیانہ سنجیدہ فکر و نظر کے آدمی تھے۔ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر تھے۔ انگریز فلسفی ہربرٹ اسپنسر کی کتاب فلسفۂ تعلیم کے نام سے ترجمہ کی، سیرت النبی پر بھی رسالے لکھے۔ ان سے بھی علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ میں ملاقات رہتی۔ اس وقت تک بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ ایک اور چھوٹے بھائی بھی تھے۔ غلام الثقلین (علیگ) وہ بھی دونوں بھائیوں کے ہم رنگ۔

غلام الثقلین اگر زندہ رہ جاتے تو شاید شیعہ سنی کو ایک دوسرے سے قریب لا کر رہتے علی گڑھ کے فدائیوں میں تھے۔

حاجی صاحبؒ

حاجی محمد شفیع بجنوری

(متوفی سنہ ۱۹۵۱ء)

نام بہ حیثیت مجذوب یا نیم مجذوب بزرگ کے بہت عرصے سے کان میں پڑ رہا تھا۔ یہ سُنا ہوا تھا کہ ہر سال حج کو جایا کرتے ہیں۔ بلا کسی ظاہری سامان معیشت کے۔ اور بڑے صاحب، کشف و کرامات ہیں۔ جنات سے مقابلہ کرتے ہیں اور بڑے بڑے سرکش جنات کو آخر شکست دے کر رہتے ہیں۔ سخت سے سخت بیماروں کو اچھا کر دیتے ہیں، اور طرح طرح کے خوارق اور عجوبہ دکھاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو کہہ دیتے ہیں، وہی ہو کر رہتا ہے۔

لکھنؤ سے جنوب کی جانب کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک قصبہ بجنور ہے۔ شیخ زادوں کا وطن اور مخزن۔ چودھری خلیق الزماں وغیرہ صدیقی شیوخ لکھنؤ کا مولد و وطن، اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ قرابتیں کچھ دریاباد میں بھی تھیں۔ شیخ زادے ہمزدم کے سمجھے جاتے۔ کبھی کبھی یہاں آجاتے تھے اور اپنے یہی روحانی کمالات دکھا دیتے۔ جب میں از سر نو مسلمان ہو لیا تو ایک آدھ بار لکھنؤ میں چلتے پھرتے دکھائی دیے، اور جب میں خود حج کر آیا تب پوری طرح ملاقات ہوئی اور جلد ہی نوبت بے تکلفی کی آگئی۔

بڑے عابد و مرتاض تھے، اور ساتھ ہی پورے مولوی بھی۔ ظاہری علوم حضرت تھانوی سے کانپور میں حاصل کیے تھے۔ اور بیعت اپنی کم سنی میں گنج مراد آباد (ضلع ہردوئی) کے مشہور بزرگ مولانا فضل رحمان سے ہوئے اور ان کی وفات کے بعد، مکہ معظمہ جا کر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (مرشد حضرت تھانوی) کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ معلوم ہوا کہ تصرفات اور خوارق کے جو قصے مشہور تھے، ان میں مبالغہ کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ مشہور یہی ہے کہ شروع شروع میں تو

بڑے ہی صاحب تصرف تھے۔ علاوہ دوسرے ثقہ راویوں کے بعض حیرت انگیز قصّوں کے راوی وناقل حضرت تھانوی تک تھے۔

جب اپنے ارادہ واختیار سے باہر کرامات سے یہ خود ہی عاجز آگئے تو حضرت مولانا ہی کے مشورے سے دعا کرکے یہ کیفیت سلب کرائی۔ اس وقت حضرت کانپور میں مدرّس تھے اور یہ شاگرد۔ اور بات اعتدال پر آگئی۔

میں نے اپنے بتیس سالہ تجربے میں نہایت درجہ عبادت گزار، شب بیدار، قانع، متوکّل، ذاکر وشاغل، خادم خلق، متواضع ومنکسر پایا، عملیات وحاضرات کے ماہر آخر تک رہے اور کتنے بظاہر لاعلاج مریضوں کو انھیں کی توجہ سے شفا ہوئی۔ خدا جانے کتنوں کو نقش، تعویذ، فیتلے دیا کرتے، اور خلقت کا ہجوم کثیر اُن کے گرد ان کی اسم "عالمانہ حیثیت سے رہتا حضرت تھانوی کے مخلص خدمت گزار ان کی زندگی بھر بنے رہے۔ اور ہم لوگوں پر شفقت کی حد ہی نہ تھی۔ یہ عزیزوں سے بڑھ کر عزیز ہو گئے تھے۔ شفقت میری ذات ہی کے ساتھ نہیں، گھر کے بوڑھے اور بچے سب کے ساتھ رہی۔ میری معصوم صفت ہمشیر کا جب لکھنؤ میں انتقال ہوا ہے ۱۹۴۵ء میں تو یہ ہمارے ہی ہاں مقیم تھے۔ نماز جنازہ میں نے اُنھیں سے پڑھوائی۔ حالانکہ کئی کئی صاحبِ علم وفتویٰ موجود تھے۔ دعائیں مانگنے کا ٹھیکہ اپنے گھر بھر کے لئے گویا انھیں کے سپرد کر رکھا تھا۔

حج کو ہر سال جاتے اور بڑے ہی شوق واشتیاق کے ساتھ، ایک والہانہ کیفیت کے مجسّم پیکر بنے ہوئے۔ حج کو عبادت عاشقانہ بعض بزرگوں نے لکھا ہے، اس کا مشاہدہ انھیں کے حج میں رہتا۔ وفات بھی عین حالت حج ہی میں ہوئی۔ غالباً ۸ ذی الحجہ ۱۳ھ، ۱۱ ستمبر ۱۹۵۱ء کو اپنے لیے جن بزرگان امت کی شفاعت پر مغفرت کے لیے ہم دونوں میاں بیوی کو ناز اور اعتماد ہے، ان میں ایک نام انھیں حاجی صاحب کا ہے۔ ہم لوگوں کی زبان پر ان کا نام "حاجی صاحبؒ" ہی چڑھا ہوا تھا۔

ایک دعا دعجب نہیں کہ حدیث میں آچکی ہو) ان کے معمولات میں تھی، نماز فرض کے بعد

اسے پابندی سے پڑھتے تھے اور بڑے تاثر و خشوع کے ساتھ۔ اسے اپنی مرتب کی ہوئی مناجات مقبول میں نقل کر چکا ہوں۔ یہاں بھی نقل کیے دیتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذُنُوْبَنَا وَاسْتُرْ عُيُوْبَنَا وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا وَاحْفَظْ قُلُوْبَنَا وَنَوِّرْ قُلُوْبَنَا وَيَسِّرْ اُمُوْرَنَا وَحَصِّلْ مُرَادَنَا وَتَمِّمْ تَقْصِيْرَنَا۔ اَللّٰهُمَّ نَجِّنَا مِمَّا نَخَافُ يَا خَفِيَّ الْاَلْطَافِ

(اَللّٰهُمَّ نَجِّنَا مِمَّا نَخَافُ کو تین تین بار بڑے الحاح کے ساتھ پڑھتے تھے)

مظہر الحق

(متوفی سنہ ۱۹۳۰ء)

نیشنلسٹ مسلمانوں میں چند نام تو مرحوموں کے ابھی تک زبان زد ہیں۔ حسرت موہانی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، مولانا ابوالکلام، رفیع احمد قدوائی وغیرہ۔ لیکن ایک نام تو کہنا چاہیے کہ زمانے کے حافظے کی لوح سے بالکل ہی مٹ چکا ہے، اور وہ نام پٹنہ کے نامی بیرسٹر مظہر الحق کا ہے۔ ایک وقت تھا، جب ملک کے مغرب و مشرق کے دو اطراف ایک ایک نیشنلسٹ مسلمان کے نام سے گونج رہے تھے، جو ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے۔ مغرب کے مسٹر جناح اور مشرق کے مظہر الحق، دونوں نامی بیرسٹر اور دونوں اپنی نیشنلزم میں ضرب المثل تھے۔ ع رہے نام اللہ کا!

ملاقات ایک بار بھی نہیں ہوئی، گو سامنا بارہا ہوا، بس نام اور صفات ہی سُن سُن کر دل مشتاق ملاقات کا رہا کیا۔ نیشنلسٹ کہلانے والے تو بہت سے مسلمان تھے، ملے جلے عقیدوں کے اور بعض تو بہت ہی مختلف عقیدوں کے۔ زمین کی اور وطن کی گویا پوجا کرنے اور زمین کو ایک دیوی یقین کرنے کی حد تک بعض پہنچ گئے تھے۔ ان خال خال کو چھوڑیے باقی جو مسلمان تھے عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر محمود، مولانا ابوالکلام اور حسرت موہانی (اور علی برادران کے نام تو میں قصداً نیشنلسٹوں میں نہیں لے رہا ہوں) ان میں ایک خاص ذات مظہر الحق کی سب سے الگ تھی، انھیں سیاسیات سے رفتہ رفتہ کوئی غرض ہی نہیں رہی تھی۔ تحریک خلافت و ترک موالات کو اختیار کر کے ان میں ایک زبردست روحانی انقلاب آگیا تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک پورے درویش ہو گئے۔ انگریزی لباس کہاں تو بہترین قسم کا پہنتے تھے۔ کہاں اب جو اسے

چھوڑا تو بہت موٹے قسم کا کھدر جسم پر لا دلیا۔ صفاچٹ چہرے کے بجائے داڑھی خوب گھنی بھی رکھ لی۔ سوٹ کیس، ٹفن باسکٹ وغیرہ ساز و سامان کے سارے لوازم فیشن کے یکسر چھوڑ دیے بستر ا بجائے ہولڈال کے سُتلی اور رسی سے باندھنے لگے۔ کھانے، کپڑے، سفر کرنے ہر چیز میں "صاحبیت" سے اُتر کر کھرے دیسی یا سودیشی بلکہ کہیے کہ گنوار سے بن گئے! اپنی کم سنی میں کسی کے اثر سے بیعت گنج مراد آباد کے مشہور عالم درویش حضرت فضل رحمان کے ہاتھ پر کر لی تھی بس وہی بیعت، ایک عمر تک بھلائے رہنے کے بعد اب رنگ لائی اور یہ فوجداری کا نامور اور آل انڈیا شہرت کا بیرسٹر بالکل ہی اللہ والا ہو گیا!

افسوس ہے کہ عمر کی مہلت زیادہ نہ پائی اور قبل اس کے کہ دوسروں کو زیادہ متاثر کرتے، سبق دیتے، خود ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ گمنامی وبے نشانی انشاءاللہ خود اجر بڑھاتی رہے گی۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ۔

اعلیٰ حضرت

(متوفی ۱۹۶۷ء)

جب سے انگلیوں نے قلم پکڑنا سیکھا، کہنا چاہیے کہ جبھی سے شبلی وحالی کی عظمت دل میں جاگزیں ہوگئی اور ان پر رشک سا کرنے لگا کہ کیسے خوش نصیب ہیں یہ لوگ حیدرآباد سے ماہانہ وظیفے پاکر تصنیف وتالیف کے کام میں لگے رہتے ہیں؟ ـــــ اور بھی جابجا یہ خبریں سننے میں آتی رہیں کہ فلاں کتاب کی طبع واشاعت کا انتظام نظام حیدرآباد نے کرا دیا ـــــ حیدرآباد کوئی چھوٹی سی ریاست نہ تھی ایک پورا اور مستقل ملک تھا، ڈاکخانہ اور تار گھر اپنا، ریل اپنی، نوٹ اور سکے اپنے۔ اور فرماں روا بھی دیکھتے دیکھتے ہزہائی نس سے ترقی کرکے ہزاگزالٹڈہائی نس ہوگئے ـــ اردو ترجمہ "اعلیٰ حضرت"، بھی بدستور رہا۔ اور ہم لوگوں کی زبان پر یہی چڑھا ہوا۔

ملی زندگی میں حیدرآباد کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ سر سالار جنگ، اقبال الدولہ، سر آسماں جاہ، مہاراجہ چندولال، مہاراجہ کشن پرشاد، رائے مرلی دھر، کی مرعوب کن سیاسی شخصیتوں سے قطع نظر، محسن الملک، وقار الملک مہدی نواز جنگ، عزیز مرزا، شرر، ظفر علی خاں نذیر احمد کتنے حیدرآباد سے "نکالے ہوئے"، حیدرآباد سے پنشن پاتے، قوم وملت کے مخدوم بنے ہوئے

جب "بد اقبال" اس پایہ کے تھے تو خوش اقبالوں کا کیا حال ہوگا! ـــــ دل میں یہ ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے تھے۔ اور اپنی کتابوں میں فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع اور سائیکالوجی آف لیڈر شپ (انگریزی نکل ہی چکی تھیں کہ اردو یونیورسٹی (جامعہ عثمانیہ) کے قیام کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور ساتھ ہی ۱۹۱۷ء میں اس یونیورسٹی کا پیش خیمہ سررشتہ تالیف وترجمہ قائم ہوا اور فلسفہ، تاریخ، معاشیات، ریاضیات وغیرہ کے مترجمین ومؤلفین مقرر ہوگئے ـــ بابائے اردو عبدالحق

(افسر مترجمین) اور سید راس مسعود، ڈائرکٹر کی طرف سے تار پہنچا کہ تمہارا تقرر مترجم فلسفہ کی حیثیت سے ہو گیا ہے، آجاؤ"، تنخواہ تین سو ماہوار سے شروع ہو گی، ۱۹۱۷ء کے تین سو آج کے تین ۳ ہزار بلکہ پر ۳ ہزار کے برابر تھے۔

خیر۔ اخیر اگست میں روانہ ہوا اور یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے کام شروع کر دیا۔ حیدر آباد دلچسپیوں اور رنگینیوں کے لئے مشہور رہا ہے، مگر اپنا دل کچھ زیادہ نہ لگا۔ ریاست کی وہی کیفیت تھی، جو اخیر زمانے میں مغلیہ سلطنت کی ہو گئی تھی۔ ہر وقت جوڑ توڑ، چوبیسوں گھنٹے سازشیں۔ یہ پارٹی اس کی فکر میں۔ وہ ٹولی اس کی دشمنی میں دو مہینے کاٹنے مشکل ہو گئے مخلصین بہت سے تھے، اور سب کے رئیس دسردار ابن الحسن بسمل موہانی۔ دوا اور عزیز دہم وطن موجود تھے۔ نئی بیاہی ہوئی دلہن کو بھی بلا لیا تھا۔ اس سب کے باوجود جی نہ لگا۔ اخیر جولائی ۱۹۱۸ء میں رخصت پر چلا آیا اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ ۸، ۹ مہینے بے کاری کے گزرے ہوں گے کہ شروع مئی ۱۹۱۹ء میں سر امین جنگ بہادر (سکریٹری بارگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ" اعلیٰ حضرت نے تم کو یاد کیا ہے فوراً آجاؤ"، خیر گیا، مگر ڈرتے ڈرتے کہ کہیں کسی بدخواہ دشمن کی یہ حرکت نہ ہو۔ حیدر آباد اسٹیشن پر حکم ملا کہ اب کی آزاد وخود مختار نہیں ہو کہ جس کے یہاں چاہو ٹھہرو۔ صدر الصدور امور مذہبی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے ہاں سرکاری طور پر قیام کرو۔ بارگاہ خسروی میں حاضری آج ہی پانچ ساڑھے پانچ بجے شام کو ہو گی۔ خیر وقت مقررہ پر پہنچا مگر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہ دیکھیے خدا معلوم کیا پیش آئے۔ کنگ کوٹھی کے بیرونی پھاٹک پر سواری رکی۔ فرلانگ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے برآمدے تک پہنچا۔ پہنچ کر یہ اطمینان ہوا کہ مصاحبین موجود نہیں، بلکہ اعلیٰ حضرت بالکل تنہا ہیں۔ کھڑے ہوئے تھے کہ حسب دستور نذر کے پانچ روپئے پیش کئے (نئے گن کے یہ سکے مولانا شروانی سے مانگ کر لے گیا تھا) نذر قبول ہوئی۔ خود ایک بالکل ہی معمولی سی کرسی پر بیٹھے۔ اور مجھ سے بھی ایک ایسی ہی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ چیز بڑی ہی عزت افزائی کی تھی۔ ورنہ بڑے بڑے "جنگ" اور بڑے بڑے "ملک" اور "دولہ" کھڑے ہی

رہتے تھے۔ گفتگو کوئی ۳۰، ۳۵ منٹ تک جاری رہی۔ سرسید کی نیچریت سے لے کر خدا معلوم کتنے متفرق موضوع چھیڑے اور میں ہر لمحہ ڈرتا ہی رہا، کہ دیکھیے میرا کون سا جواب مردود ٹھہرتا ہے۔ اس کے بعد ہی فرمان صادر ہو گیا، کہ میرے لیے گھر بیٹھے ۱۲۵ سکہ انگریزی کی علمی پنشن تاحیات مقرر کی جاتی ہے۔"

سالہا سال اس رقم پر گزر کرتا رہا۔ ۱۹۴۶ء میں جب روپئے کی قیمت ایک چونی کے برابر رہ گئی تھی، یہ رقم سر مرزا اسماعیل کی حسن توجہ سے بڑھ کر دو سو ہو گئی (بلکہ اُن بیچارے نے تو سفارش ما ؍ ۲۵۰ ماہوار کی کی تھی)

دربار عام میں ایک بار شرکت ہوئی، اور حالات سننے میں تو بہ کثرت آتے رہے شخصی سلطنت کا آخری نمونہ انھیں کی ذات تھی اور شخصی سلطنت میں معلوم ہے کہ لعنتیں اور برکتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اعلیٰ حضرت مرحوم کی خوبیاں ان کی کمزوریوں سے بہت زائد تھیں۔ اور یہ کمزوریاں ہر اچھے سے اچھے شخص میں بھی ہوتی ہیں۔ چہ جائیکہ تمام تر شاہی ماحول کے اندر پرورش پلے ہوئے شخص میں!

رسولؐ کے نام سے تو جیسے انھیں عشق تھا۔ اور اسی لیے ہر عرب کی خدمت کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ جو اُن تک رسائی پا سکے۔ اور ان تک رسائی میں ہرگز ایسی دشواری نہ تھی جیسی عموماً شاہی شخصیتوں کے ہاں ہوتی ہے۔ کتنے ہی مفلسوں، حاجتمندوں کی امیدیں اور آرزوئیں اُنھیں کی ایک ذات سے وابستہ ہوتی تھیں۔ اور ان کا معاملہ اس ذات کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنا قانون یہ بنا رکھا ہے کہ۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ نیکیاں بدیوں کو بہالے جاتی ہیں

عجب کیا کہ لکھو کھا مخلوق کی دعائیں میر عثمان علی خاں کی ذات سے متعلق حشر کے دن عدلِ خداوندی کو فضلِ خداوندی میں تبدیل کر کے رکھ دیں۔!

چودھری صاحب

(متوفی ۱۹۷۳ء)

چودھری خلیق الزماں میری والدہ کے حقیقی ماموں زاد بھائی کے لڑکے ہیں۔ اور اس لیے اس رشتے سے میرے بھائی ہیں۔ سن میں مجھ سے ڈھائی تین سال بڑے۔ ہم لوگ قدوایون میں ہیں۔ اور وہ قصبہ بجنور (لکھنؤ) کے کھرے شیخ زادے۔ اودھ کے قدوائیوں کو لکھنؤ کے شیخ زادوں نے نسب میں برابر کا سمجھا اور بے تکلف لڑکیاں دیں بھی اور لیں بھی۔ لڑکپن بھر ہم لوگ الگ الگ سے رہے، ان کا مستقل قیام لکھنؤ میں۔ میں اپنے والد ماجد کے ساتھ لکھنؤ سے باہر لکھنؤ کا مشہور اسکول کوئنس (Queen's) کے نام سے تھا۔ وہ اس میں پڑھتے اور کھیل میں ناموری حاصل کرتے رہے۔ میری تعلیم زیادہ تر سیتاپور میں ہوتی رہی۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں کالج میں پڑھنے لکھنؤ آیا۔ اس وقت تک وہ علی گڑھ جا چکے تھے۔ میں نے بی، اے لکھنؤ سے کیا اور ایم، اے کرنے علی گڑھ ۱۹۱۲ء میں گیا۔ وہ علی گڑھ بی اے اور ایل ایل بی کر کے اسی وقت چھوڑ چکے تھے۔

لکھنؤ میں انھیں دیکھا تو ایک جوان رعنا و خوش رو کی شکل میں۔ اب وہ وکالت شروع کر چکے تھے۔ مولوی محمد نسیم نامور ایڈوکیٹ لکھنؤ کے جونیر کی حیثیت سے ترقی کر رہے تھے، رفاہ عام کلب (لکھنؤ) کے ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے۔ پالیٹکس میں حصہ لینے لگے اور راجہ محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری بھی کچھ دن کے لئے ہو گئے تھے۔ لکھنؤ مرکزی مقام اور راجہ صاحب محمود آباد کی شخصیت بھی بہت مرکزی، خود بھی بیز وطرار اور ملنے جلنے والے، مسلم پالیٹکس میں جلدی جگہ پیدا کر لی۔

ان کے ایک بڑے بھائی کی نسبت لڑکپن سے دریاباد کی ایک لڑکی کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ ان کی سگی خالہ زاد بہن تھیں۔ جب شادی کا عین وقت آیا تو ہونے والے نوشہ صاحب انکار کر گئے۔ لڑکی بیچاری صورتاً کچھ یوں ہی سی تھی۔ اب عین وقت پر کیا ہوتا۔ اور سگی بہنوں کا معاملہ تھا۔ قصبات میں بہت بڑی بدنامی کی بات تھی۔ ان کی والدہ اپنی جگہ پر سخت شرمندہ کہ اب سگی بہن کو کیا منھ دکھاؤں گی۔ خدا جانے بات کہاں تک پہنچتی۔ چودھری صاحب یہ منظر دیکھ کھٹ سے اپنے لئے راضی ہوگئے۔ بولے کہ میں دوسری شادی کا حق اپنی پسند و مرضی کے موافق آئندہ کے لئے محفوظ رکھتا ہوں، لیکن اپنی ماں، باپ کی بات خراب نہ ہونے پائے، اس لئے عقد اسی وقت قبول کئے لیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ عمر بھر انشاء اللہ نباہ کروں گا اور خرچ برابر دیتا رہوں گا۔ گھر بلکہ خاندان ایک بڑے فتنے سے بچ گیا۔ جو وعدہ کیا اسے کرکے دکھا دیا۔

برسوں کے بعد دوسری شادی شہر کے ایک مشہور خاندان میں ایک شاعرہ وادیبہ سے اپنی پسند سے کی۔ لیکن اُن پہلی بیوی کے ساتھ بھی نباہ کر دکھایا۔ خرچ ان کو آخر تک دیتے رہے اور اولادیں بھی اُن کے بطن سے کئی ہوئیں ——— نو عمری میں ماں کی خوشی کی خاطر اپنی پسند و مرضی کا خون کرنا کوئی آسان مجاہدہ نہیں۔

علی گڑھ ہی میں تھے کہ جنگ بلقان کے سلسلے میں مولانا محمد علی نے جو طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ٹرکی بھیجا تھا، اس کے ممبر ہوگئے اور بھی طرح طرح سے مسلم سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ خلافت کمیٹی جب ہندستان میں ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی اور اس کی شاخوں کا جال سارے ملک میں پھیل گیا۔ تو بعض تحریروں کے مطابق اس کے بانی سرپرست وہی کہلائے۔

۱۹۲۵ء سے میں اودھ خلافت کمیٹی کا باضابطہ صدر بن گیا تھا۔ لیکن حقیقتاً اس کی قیادت چودھری صاحب کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد بھی مدتوں وہی کرتے رہے۔ صدر صوبہ

یں انھیں کے حکم سے بنا تھا۔

مدتوں کانگریس میں شریک رہے اور پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال کے خاص اور خصوصی گروہ میں سے تھے۔ خلافت کمیٹی میں مولانا شوکت علی کے خاص منظور نظر تھے۔ کانگریس میں اس کی ڈکٹیٹری کے زمانے میں اس کے ڈکٹیٹر تک ایک بار بن چکے تھے۔ پھر پاکستان کے قیام کے بعد چودھری صاحب جب کراچوی ہو چکے تھے، ایک بار پھر وہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہو گئے تھے۔ اور ان کا مرتبہ جناح صاحب کے ماتحتوں میں سے کسی سے پست نہ رہا، آخر میں جناح صاحب سے بھی اُن سے نہ بنی۔ اُن کی انگریزی کتاب PATHWAY TO PAKISTAN اور اس سے بھی بڑھ کر اردو کتاب شاہراہ پاکستان دیکھنے کے قابل ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور ملت اسلامی کے لئے ایک بڑا خلا چھوڑ گئے تھے۔ جو کبھی بھی پورا نہ ہو سکا سنہ غالباً ۱۹۴۶ء تھا جب آخری بار (لکھنؤ) ہندوستان میں الیکشن لڑا، وہیں مختلف وجوہ و اسباب سے خود مسلمانوں ہی کا ایک کھاتا پیتا طبقہ چودھری صاحب کا سخت مخالف ہو گیا تھا۔ اور اس کے پیش نظر ان کے بعض مخلص کارکنوں کے چھکے چھوٹ چکے تھے۔ لیکن خود ان پر ذرا بھی اثر نہ تھا نہ مایوس ہوئے، نہ جھنجھلائے۔ اطمینان و سکونِ خاطر سے اپنے معمولات میں لگے رہے۔ آخری لمحے تک اپنی ملت پر اعتماد اور اللہ کے فضل پر توکل کیے رہے۔ اور لکھنؤ میں آخری بار اللہ اکبر کے بلند بانگ نعرے اب تک یاد ہیں۔ کون جانتا تھا کہ دارالکفر میں توحید کی یہ پکار آخری بار ہو رہی ہے۔

لکھنؤ میں میونسپل بورڈ کی چیرمینی کسی مسلمان کو ملنا آسان نہ تھی۔ چودھری صاحب اس دم خم کے تھے کہ ایک بار نہیں، چار چار بار اس عہدے پر سرفراز رہے۔ سالہا سال انھیں پاکستان ہجرت کیے ہو چکے ہیں، لیکن اب بھی جب کبھی لکھنؤ میں موجود ہوتا ہوں اور خاتون منزل (اپنے مکان مسکونہ) کے قریب موٹر کی آواز سنتا ہوں تو بے ساختہ یاد چودھری صاحب کی آجاتی ہے۔ موٹر نشینوں میں وہی ایک ایسے تھے جو بارہا اپنی آمد سے خوش وقت کرتے رہتے تھے۔

پاکستان میں جس طرح اور کسی کی بھی قدر نہ ہوئی، یہ بھی نا قدری کے شکار رہے۔
ایک مرتبہ کسی مسلم ملک کی سفارت ملی، اور ایک بار مشرقی پاکستان کی گورنری۔ ذاتی تعلقات
ان کے اور گورنر جنرل غلام محمد سے بہت قدیم اور گہرے تھے۔ بلکہ گویا بھائی معلوم ہوتے تھے
پاکستان کے اٹارنی جنرل وسیم مرحوم چودھری صاحب کے بہنوئی بھی تھے اور ماموں زاد بھائی
بھی۔ عالم اسلامی سے ربط و ارتباط رکھنا ایک وفاق اسلامی قائم کرنا، انگریزی اصطلاح
میں (Pan Islamism) اس فلسفے کے داعی۔ جمال الدین افغانی، رشید رضا مصری
اقبال و محمد علی کے بعد اب شاید صرف خلیق الزماں دنیا میں باقی رہ گئے۔ دیکھیے یہ جھلملاتا ہوا چراغ سحری
کب تک قائم رہتا ہے؟

عین جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں مارچ ۱۹۷۳ء میں کراچی سے چودھری صاحب
کی وفات کی خبر آگئی ۔ ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا ‌ یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک!

محمد علی مرحوم کی کچھ جھلک اگر باقی تھی تو انھیں میں۔ آخر کے کئی برسوں میں مجھ پر بہت
زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ خط لکھنے کے عادی بہت کم تھے اس پر بھی مجھے وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔
اور ہر خط میں میری تفسیر قرآن کی ہمت افزائی کرتے، یہ بھی لکھتے "کہ کام تو تم نے کیا ہے" میں نے
پالیٹکس میں پڑ کر محض وقت ضائع کیا۔"

پیٹرک گیڈس

(متوفی ۱۹۳۱ء)

۱۹۱۷ء تھا اور میری شادی کو تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ برطانیہ کے مشہور سائنٹسٹ پروفیسر پیٹرک گیڈس (PATIRAK GEDDES) ہندوستان آئے۔ اور لکھنو بہ حیثیت ٹاون پلاننگ اکسپرٹ (آبادی شہر کے ماہر) کے بلائے گئے۔ اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹی، سینٹ اینڈریوز میں نباتات کے اُستاد تھے اور یہی BOTANY ان کا خصوصی فن تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ۱۹۱۱ء والے ایڈیشن میں ان کے مضمون اسی فن سے متعلق چھپ چکے ہیں۔ گویا ان کی یہ ماہرانہ حیثیت پوری طرح مسلّم ہو چکی تھی، اور اب اُنھوں نے ٹاؤن پلاننگ (TOWN PLANNING) میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ قیصر باغ کی بارہ دری ان کے کھینچے اور بنائے ہوئے نقشوں سے لبالب تھی اعلیٰ درجے کا یونیورسٹی پروفیسر مجھے ہندوستان میں کہاں دیکھنے کو ملتا، مجھے اس سِن میں ان سے افراط حسن ظن تھا۔ ان کی ہستی میرے لیے ایک نعمت عظیم تھی۔ اس وقت تک اپنا قیام بھی لکھنو ہی میں تھا۔ دیکھنے بلکہ خود صاحب کو دیکھنے قیصر باغ گیا، وہ اس وقت ملے نہیں، ان کی میم صاحب سے مل آیا۔ دوسرے دن ان کی قیام گاہ پر گیا، ملے اور بڑے تپاک سے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہونے پایا کہ یورپ کا ایک فاضل اُستاد ایک ہندوستانی طالب علم سے مل رہا ہے۔ انگریزی گفتگو میں میری مشق بڑھی ہوئی تھی صاحب سے چھوٹے بڑے ہر موضوع پر گفتگو دل کھول کر کر ڈالی ــــ پھر ایک روز دیکھتا کیا ہوں کہ لکھنو کے محلے کی گلیوں میں میرا مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچ گئے۔ اتفاق سے کپڑے میلے کچیلے پہنے ہوئے تھا اور بال کٹا کر نہانے جا رہا تھا۔ معذرت میں محض NOT AT HOME کہلا بھیجا۔ بیچارہ بغیر ذرا بھی ناگواری محسوس کیے ہوئے

خود ہی شرمندگی کے ساتھ واپس چلا گیا ــــ اور مغربی معیارِ شرافت و وضع داری کا پورا تجربہ ہو گیا ۔!

پھر ایک روز شام کو ۱۹۱۸ئہ میں ان کی کھانے کی دعوت لکھنؤ کے ایک انگریزی ہوٹل میں کی ، اور نئی نویلی بیوی کو انگریزی کے چند جملے رٹا کر ان سے ملانے لے گیا ۔ وہ شرم سے کچھ زیادہ بول نہ سکیں ، اور یہ ملاقات بھی اچھی رہی ۔

یہ ولایت واپس گئے اور کئی برس بعد ۱۹۲۳ء میں میں حیدر آباد آیا وہیں معلوم ہوا کہ یہ صاحب اب وہاں موجود ہیں ، اور عثمانیہ یونیورسٹی کے مہمان ہیں ۔ پرنسپل اس وقت ڈاکٹر عبدالستار سندیلوی میرے پرانے کرم فرما تھے ۔ ان سے میرا پتا پوچھ کر میرے پاس آئے ۔ اب میں اس چھ برس کے عرصے میں بالکل بدل چکا تھا ۔ الحاد تشکیک کے بجائے پورا پختہ مسلمان بن چکا تھا ۔ اور "صاحب" لوگوں سے کوئی کشش باقی ہی نہیں رہی تھی ۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاں دعوت پر مجھے بلا دیا ۔ سادی سی میز پر کچھ ہندوستانی قسم کا کھانا کھا رہے تھے ، گرم جوشی سے پیش آئے ۔ مگر اب میں وہ کہاں تھا ۔ مغربی تہذیبِ اخلاق پر برابر چوٹیں کرتا رہا ۔ یہ بہت ہی گھبرائے ABDUL MAJID YOU ARE ABSURD اس قسم کے فقرے بار بار کہتے رہے اور مجھ کو ایک قسم کا مذہبی دیوانہ سمجھے اور آخر میں یہ جملے کہے I HOPE YOU WILL GET OVER IT تم پر ایک قسم کی دیوانگی طاری ہو گئی ہے ۔ لیکن یہ عارضی ثابت ہو گی اور تم اس مرض سے اچھے ہو جاؤ گے ۔"

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں میں نے انھیں اپنے پرانے کالج کیننگ کالج میں لیکچر دینے کا انتظام کر دیا اور جب اس کا ذکر اپنے پرانے اور محبوب پرنسپل ڈاکٹر کیمرن سے کیا ، تو وہ خوشی سے اچھل پڑے ، ان کے خیال میں یہ بڑی ہی جسارت میں نے کر ڈالی تھی ۔ پھر ان کے ہوٹل سے میں خود کیمرن صاحب کے ساتھ انھیں کی گاڑی پر جا کر لایا ۔ اس وقت تک کیمرن صاحب کے پاس موٹر نہ تھا ۔ البتہ فٹن رکھتے تھے ۔

گیڈس صاحب آخر میں بمبئی یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے پروفیسر ہو گئے تھے، مجھے برابر یاد رکھا اور ایک خط میں لکھا کہ تم بطور اسسٹنٹ پروفیسر آف سوشیالوجی کے میرے پاس آجاؤ۔ لیکن میں اب کہاں اس جال میں پھنسنے والا تھا۔ معذرت لکھ کر یہ قصہ ہی ختم کر دیا۔

۱۹۳۱ء میں انتقال کیا، سال پیدائش ۱۸۵۴ء تھا۔ ان کے تجربے اور خاصے لمبے سابقے سے معلوم ہوا کہ جو صفات مشرقی سمجھے جاتے ہیں، خاکساری، فروتنی وغیرہ۔ ان سے یورپ کے فاضل اور سائنٹسٹ خالی نہیں۔

ایسے لوگوں کے حق میں دعائے خیر بے اختیار لبوں تک آجاتی ہے۔

کچھ برابر والے

کچھ برابر والے

(۱) ڈاکٹر صاحب

(۲) افضل العلماء کرنولی

(۳) ایک پیکرِ عفت

(۴) غازی مسعود

(۵) بدایونی ۔ ہم نام نامور

(۶) ایک زندہ جنتی

(۷) مولانا عبدالباری ندوی

(۸) سید ہاشمی

(۹) پریم چند

(۱۰) ہوش یار جنگ

(۱۱) مودودی صاحب

(۱۲) امین الحسن بسمل موہانی

(۱۳،۱۴) مہر و سالک

(۱۵) ملا واحدی

(۱۶) مناظر احسن گیلانی

(۱۷) ابوالکلام

(۱۸) ظفر حسین خان

(۱۹) بہادر یار جنگ

(۲۰) نیاز فتحپوری

(۲۱) مولوی صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی

(۲۲) میر نیرنگ

(۲۳) ڈاکٹر سید ظفر الحسن

(۲۴) مولانا سید سلیمان ندوی

(۲۵) سالار جنگ ثالث

ڈاکٹر صاحب

(متوفی سنہ ۱۹۶۱ء)

"معصوم" شرعی و اصطلاحی معنی میں نہیں اردو محاورے میں میں کبھی لکھ چکا ہوں کہ
میں نے تین ہی دیکھے ہیں۔ ایک اپنی حقیقی ہمشیر، دوسرے مولوی عبدالرحمن نگرامی، اور تیسرے
یہ حکیم ڈاکٹر عبدالعلی۔ ہم لوگوں کی زبان پر صرف ڈاکٹر صاحب۔

رہنے والے رائے بریلی کے اور رکن ایک محترم و متبرک خاندان کے۔ ان کے والد ماجد
حکیم عبدالحیؒ خود ایک اچھے طبیب اور قابل و فاضل اور محترم بزرگ تھے۔ مدتوں ندوے کے نائب
ناظم رہے، اور پھر ناظم ہو گئے۔ بڑے خاموش، متین، حلیم اور سرگرم کارکن۔ لڑکپن میں
جب کالج کا طالب علم تھا، اکثر ان کی طرف سے گزرنا ہوتا۔ انھیں بڑے وقار کے ساتھ ایک
چوکی پر بیٹھا ہوا مریضوں کی نبض دیکھتا پاتا۔ ارکان ندوہ میں بڑے افسوس ناک مناقشے چلتے
ایک انھیں کی ذات بے ہمہ و باہمہ ہوتی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔ ان کے جوہر تو ان کے بعد
ان کے قلمی مسودات سے کھلے۔ اردو کے اچھے ادیب اور پاکیزہ سخن سنج، عربی کے فاضل، مورخ،
تذکرہ نگار، صاحب بنیش بھی اور صاحب دانش بھی۔ اصلاً میرے والد مرحوم کے بھی ملنے والے
تھے خود بھی ایک بار کا ملنا یاد پڑتا ہے۔ ایک مریض کو ساتھ لے کر گیا تھا۔

بڑے لڑکے عبدالعلی کو علاوہ عربی و دینی علوم میں تکمیل کرانے لکھنؤ یونیورسٹی (کیننگ کالج)
سے بی ایس سی کرایا۔ یہ ہر طرح سعید و صالح تو بچپن سے تھے ہی، اور سنجیدہ و شوقین علم بھی، انگریزی
علوم میں بھی برق نکلے۔ چنانچہ کیمسٹری کے مضمون میں امتیاز حاصل کیا۔ میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخلہ ہو ہی
چکا تھا، یہیں ڈاکٹر بنانے کے لیے بٹھا دیا۔ اور پانچ برس میں یہ گورا چٹا، داڑھی والا لڑکا پورا ڈاکٹر

بن گیا۔ طبیب اس کے علاوہ ـــــــ داڑھیاں اتنی خوشنما میں نے دو ہی دیکھی ہیں۔ بال ریشم کی طرح ملائم۔ ایک تو انھیں کی، دوسری مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی۔ اور ہاں دو داڑھیاں اور بھی خوب خوشنما دیکھی ہیں، ایک مولانا سید سلیمان ندوی کی اور دوسری مولانا مناظر احسن گیلانی کی۔

ڈاکٹر صاحب بہت ہی کم سخن تھے۔ مریضوں تک سے بیماری کی پوچھ گچھ کچھ زائد نہ کرتے۔ معالج کے لئے کم گوئی ہنر نہیں عیب ہے۔ لیکن ان کے حق میں اللہ نے اس عیب کو بھی ہنر بنا دیا تھا۔ زبان سے متعلق ان سے شاید کوئی پرسش ہی نہ ہو۔ دست شفا خداداد تھا۔ اُسی آبائی مطب میں مطب خود ہی شروع کر دیا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے جہاں طبیب کی چوکی بچھی رہتی تھی، وہاں اب ڈاکٹری میز کرسیاں لگ گئیں۔ اور مریضوں کا مجمع شاید پہلے سے کچھ زیادہ رہنے لگا۔ یونانی و ڈاکٹری کے علاوہ ہومیوپیتھی وغیرہ کچھ اور طب بھی جانتے تھے۔ جس مریض کا علاج جس فن سے مناسب سمجھتے کرتے ہیں اپنے اور اپنے والوں کے لئے ترجیح تو اکثر یونانی ہی کو دیتا ـــــــ اپنے دور الحاد و تشکیک میں اپنے بائیں بازو پر میں نے اپنی محبوب منگیتر کا نام انگریزی اور اردو میں گدوا لیا تھا. گدوانے میں تکلیف بھی اچھی خاصی ہوئی تھی۔ اور نام کے علاوہ ایک بڑا سا گلاب کا پھول بھی گودنے والے نے گود دیا تھا، اب جب کئی برس کے بعد از سر نو مسلمان ہو لیا تو اس بازو کو وضو وغیرہ کے لئے کسی کے سامنے کھولتے بڑی شرم آنے لگی۔ آخر طے کیا کہ اس سب کو کھرچوا ڈالوں، اور جو کچھ بھی تکلف اس میں ہو، اُسے برداشت کروں، چنانچہ اس کے لئے انھیں ڈاکٹر صاحب کو زحمت دی۔ انھوں نے گھر آکر دیر تک گوشت کو چھیلنے اور کھرچنے کا آپریشن کیا اور زخم کی مرہم پٹی عرصے تک روزانہ ہوتی رہی۔

ندوے کے ناظم مدتوں رہے اور خدمت خاموشی سے کرتے رہے، جب نگار (نیاز فتحپوری) کے ماہنامے کی ملحدانہ روش کے خلاف مہم مجبوراً چلانا پڑی تو اس میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ اور اس کے علاوہ جب کبھی کوئی موقع کسی دینی و ملی تحریک

میں شرکت واعانت کا پیش آتا تو کبھی پیچھے نہ رہتے۔ آخر میں صحت خود ہی بہت خراب رہنے لگی تھی، جب ۱۹۶۱ء میں وفات پائی ہے تو نماز جنازہ رات کے وقت ہوئی۔ ہمارے ہاں کی عورتیں تعزیت میں گئی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ زمین سے آسمان تک نورانیت نمایاں تھی، اور یہ نورانیت کی بات بالکل دل کو لگتی ہوئی تھی۔

افضل العلما کرنولی

(متوفی ۱۹۵۸ء)

افضل العلماء کوئی عام تعظیمی لقب نہیں، مدراس یونیورسٹی کی ایک ڈگری کا نام ہے۔ عربی کے فاضلوں کو امتحان پاس کرنے پر ملا کرتی ہے۔ عبد الحق کرنولی کے نام کے ساتھ اس کا اضافہ ضروری ہے، بابائے اردو کے نام سے اشتباہ سے بچنے کے لیے نام عرصے سے سن رہا تھا۔ اور نام جب سُنا تو ساتھ ہی علم و فضل کے کمال اور دینی و مغربی علوم کی جامعیت کی تعریف بھی سُن لی۔ اسلامیت کے پیکر تھے۔ غیرت ملی کی داد ہر زبان سے سُنی۔ تقسیم ملک کے بعد علی گڑھ کچھ دنوں کے لیے پرو وائس چانسلر کے عہدے پر آ گئے۔ پروگرام بیچارے نے یہ بنایا تھا کہ اپنا مشن مدراس میں پورا کر کے دو چار برس بعد علی گڑھ پھر واپس آئیں گے اور اس کی گرتی ہوئی اسلامیت کی نئے سرے سے تجدید کریں گے۔

شروع ۱۹۵۷ء تھا کہ مدراس یونیورسٹی کے رجسٹرار کا خط آیا کہ آئندہ سال سیرت نبویؐ پر فلاں وقف کے منشا کے مطابق مدراس آ کر انگریزی میں لکچر دو۔ نو سو روپے معاوضہ ملے گا۔ جواب لکھ دیا کہ قبول خدمت سے معذوری ہے۔ اور اپنے نزدیک بات ختم کر دی۔ کچھ دن بعد کیا دیکھتا ہوں کہ خط افضل العلما کا چلا آ رہا ہے کہ عنقریب دہلی اپنے کام سے آ رہا ہوں۔ لکھنؤ بھی آنا ہے اور اجازت دیجئے کہ میں دریاباد آ کر آپ سے ملاقات کروں اور ان لکچروں کے سلسلے میں بات چیت۔ جواب عرض کیا گیا کہ "ضرور کرم فرمائیے مگر اب رمضان مبارک شروع ہو رہے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ روزہ دار بن کر میرے مہمان نہ ہوں، سوکھی اور روکھی مہمانی سے معذور ہوں"۔ خیر۔ آئے اور لکھنؤ سے دریاباد تک اپنے لکھنوی میزبان کے موٹر پر آئے۔ دیکھا،

تو دیکھنے پر اس سے بھی بڑھ کر نکلے جو سُنتے ہوئے تھے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ! بڑے مہذب اور بڑے خوش لہجہ۔ آکر بالآخر انھوں نے پیام کو اس صورت میں پیش کیا کہ میری مجال انکار کی نہ رہی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مقالے کی زبان انگریزی کے بجائے اُردو کر دی۔ اور مدت قیام مدراس بجائے دو ہفتے کے، کل ایک ہی ہفتہ رکھی۔ معاوضہ بھی پورا ایک ہزار کر دیا (۱۹۵۶ء کی ایک ہزار کی رقم آج کے پانچ چھ ہزار کے برابر تھی) گویا وقت اور محنت دونوں میں نمایاں کمی کر دی! ——— اور اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کی کہ ادائی فوراً نافذ ہو گی (یہ نہیں کہ بل پیش کر کے منظوری کا انتظار کیا جائے) اور سب سے بڑھ کر نئی بات یہ کہ یونیورسٹی کے فلاں اردو امتحان میں ماڈریٹری بھی اُنھیں تاریخوں میں، اور اس کی فیس الگ! آمد و رفت کے مصارف اسی مد سے!

لکچروں کا موضوع یہ قرار پایا کہ "سیرت نبویؐ قرآن مجید سے" خاص میری پسند کا عنوان۔ اور لکچر تیار کرنے کی مُہلت کوئی آٹھ مہینے کی! یعنی کہیں جنوری ۱۹۵۸ء میں لکچر دینے ہوں گے اور گفتگو ہوئی تھی اپریل ۱۹۵۷ء میں! میں اب کیا دیوانہ تھا کہ اتنی نرم شرطوں پر بھی اپنا انکار قائم رکھتا؟ میری رضامندی سے بڑے ہی خوش و مطمئن واپس گئے۔ ادھر میں بھی خوش کہ اسی بہانے اتنی نادر خدمت سیرت نبویؐ کے سلسلہ میں انجام دینے کا موقع مل رہا ہے! اتنے متواضع، متوازن اور سلجھے ہوئے دل و دماغ والے کے ساتھ موقع کم ہی ملتا ہے!

جنوری ۱۹۵۸ء میں جب پہنچا اور کئی دن قیام رہا، تو یہ تاثر کئی گنا بڑھ گیا۔ اپنے ہاں رکھا اور جگہ بالاخانہ کی تنہائی پر دی۔ جہاں آنے والا آسانی سے اور بغیر مالک مکان کی اجازت و رہنمائی کے پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھ سے مردم بیزار مہمان کے لئے یہ انتظام بڑے ہی آرام و سہولت کا رہا۔ صبح ناشتے کے لئے مجھے دیر تک آزاد و تنہا چھوڑے رکھتے۔ ناشتہ مقدار میں وافر اور تنوع میں رنگارنگ، میرے پاس بھجوا دیتے۔ اور جب میں فراغت کر لیتا، تو بھی فوراً نہیں، کچھ دیر بعد اجازت لے کر کمرے کے اندر قدم رکھتے۔ ہر کس و ناکس سے نہیں، بہت ہی مخصوص لوگوں

سے ملایا۔ صرف چند ہی جگہیں مجھے دکھانے گھمانے لے گئے مثلاً مزار یا مسجد ملّا بحر العلوم لکھنوی۔ یا تھیوسافیکل سوسائٹی کا مرکز "ادیار" لکچر پڑھ کر سُنانے تک کی زحمت مجھے نہ دی۔ میری طرف سے خود ہی سُنا دیتے رہے، خوب رواں "فر فر" گویا لکچر خود انھیں کے لکھے ہوئے تھے! اجنبیت کسی پہلو سے بھی نہ معلوم ہونے پائی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی زبان کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہیں۔ فسانۂ آزاد پورا پڑھے ہوئے ہیں۔

ایک دن ادیار مجھے لے گئے، اور جو سارے ہندوستان کا نہیں، ساری دنیا کے ہند یہ تصوف کا مرکز ہے۔ عجیب پر فضا مقام ہے۔ ایک بہت بڑا گنجان باغ، جنگل کا سا وسیع، بلا کا سناٹا شہر کے شور شر سے بالکل امن۔ معبد ہر ہر مذہب کا اس رقبے کے اندر بنا ہوا، ہندوؤں کے لئے مندر، مسیحیوں کے لئے گرجا، مسلمانوں کے لئے مسجد، یہود کے لئے ہیکل وغیرہ۔

مغرب کا وقت آگیا تھا، اُنہیں نے اذان دی اور اسی مسجد میں تین بندوں کی مختصر جماعت نے نماز ادا کی ـــــ بحر العلوم لکھنوی فرنگی محلی کا مزار بھی میرے لئے بڑی کشش کی جگہ ثابت ہوا۔ محسوس ایسا ہوا کہ مولانا کی روحانیت فرنگی محل لکھنؤ کے ایک قریبی دگونا گوں توسل کی حاضری سے بہت خوش ہو رہی ہے۔ اور مہمانداری کا انتظام خود کر رہی ہے۔ جسٹس بشیر، پروفیسر عبد الوہاب بخاری، اور مولوی عبد الباری مدراسی کی ملاقاتوں نے بڑا لطف دیا، اور سب سے بڑھ کر خوش فکر، خوش اقبال، دخوش گوار شخصیت خود افضل العلماء کی ثابت ہوئی۔ عقائد کے لحاظ سے پختہ دیندار اور غیرت ملّی سے لبریز۔ عقل و ہوشمندی کو جذبات پر غالب رکھے ہوئے۔ علی گڑھ کی طرف سے بڑے فکر مند، علمی اصلاح کے لئے بے چین اور وقت کے منتظر۔ عہدے کے لحاظ سے ریاست مدراس کے پبلک سروس کمیشن کے سینیر ممبر، عنقریب ہوجانے والے صدر۔ دینی و سیاسی خیالات دونوں میں بڑے متوازن۔ زبان کے محتاط اور خبردار۔ خوبیوں کا ایک مجموعہ۔ خوش خصالیوں کا ایک گلدستہ۔

میں جب مدراس پہنچا ہوں اور گھر جاکر ابھی بیٹھا ہی تھا، ابھی چائے وغیرہ کچھ نہیں آئی تھی کہ

خدمت گار نے لاکر ایک تار پیش کیا، انھوں نے پتا پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں سہم کر رہ گیا کہ ہو نہ ہو گھر کے کسی عزیز قریب کی وفات کا تار آیا ہے اور وہ کوئی اور کون ہو سکتا ہے، محبوب بیوی ہی ہونگی! ڈرتے ڈرتے، اور دعائیں پڑھتے تار کھولا تو وفات میرے سالے خان بہادر حاجی مسعود الزماں کی لکھی تھی! سناٹے میں آگیا! میزبان بڑی مناسب تعزیت کرتے رہے! اپنے ایک بھائی کی یک بیک وفات کا قصہ اسی سے ملتا ہوا بیان کیا۔ یہ بھی کہا کہ اگر آپ باندے جانا چاہیں تو ہوائی جہاز کا انتظام کانپور تک ابھی کرا سکتا ہوں۔ میں نے کہا اب بیکار ہے۔ تدفین میں تو شرکت کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ پھر رات کو مجھے ریڈیو گھر لائے اور ٹرنک کال لکھنؤ کے لئے (براہ کلکتہ) کر کے میری گفتگو فون پر خاتون منزل میں زاہدہ سلمہا سے کرا دی۔ اگر وہ خود زحمت گوارا کر کے میرے ساتھ نہ آتے، تو ہرگز کوئی صورت لکھنؤ سے فون کرنے کی نہ بن آتی۔ آخر لکچر کے بعد اسی شب میں میری دعوت ایک خوش مذاق پنجابی تاجر نذیر حسین کے ہاں کرا دی، یہ ضیافت ہر طرح میرے مذاق کی رہی۔

آخری لکچر کے بعد مجھے رضامند کر کے اپنے وطن کرنول ایک دن کے لیے لائے۔ مدراس سے وادی تک ریل پر، اور صبح سویرے وادی پر ناشتہ کرا کے موٹر سے کرنول میں دن بھر کے لیے لائے۔ یہاں کا پروگرام بھی بہت خوب رہا۔ میزبان کے مولد میں ان کے والد ماجد کی تربت پر فاتحہ پڑھا۔ مدراس میں جو لکچر دیے تھے ان کا ایک حصہ یہاں بھی شام کو عثمانیہ کالج کے طلبہ کو سنا دیا گیا۔ رات کو طلبہ کے ہوسٹل میں ایک دعوت تھی۔ اس میں بھی مجھے شریک کیا۔ کھانا بہت ہی لذیذ تھا۔ پھر رات کی گاڑی سے مجھے روانہ حیدر آباد کے لئے ہونا تھا۔ مرحوم۔ اسٹیشن تک آئے اور مجھے سوار کر کے رخصت ہوئے۔ مدراس اور کرنول دونوں جگہ اُن کی مقبولیت و مرجعیت دیکھ کر یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ان کا نفس خود بھی اس درجہ مدح و داد سے متاثر نہ ہوا ہو، چنانچہ دعا تصریح کے ساتھ حفاظت نظر کی کی۔ اور بڑی ہی شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ ان سے رخصت ہوا، کچھ ہی دن بعد وہ پبلک سروس کمیشن کے

چیرمین ہو گئے ۔ خدا معلوم کیا کیا کام کرتے ۔ اور پھر علی گڑھ جا کر کیسی کچھ اس کی خدمت کرتے ، کہ مشیّت کو کچھ اور ہی منظور ہوا ، اور مختصر سی بیماری کے بعد انھیں دنیا سے اُٹھا لیا گیا ۔ اُمّت و ملت کی بدنصیبی کے سوا اس کو اور کیا کہا جائے ! بہادر یار جنگ مرحوم ہی کی طرح ان کی حسرت ناک موت پر کلیجہ مسوس کر رہ گیا !

مغربیت کے ساتھ مشرقیت اور خالص اسلامیت کی آمیزش ایسی کم ہی کہیں دیکھنے میں آتی ! دو مرتبہ آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لے کر آئے اور دو ہی مرتبہ حج سے بھی مشرف ہوئے ۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ ۔ کئی سال بعد پھر ایک بار لکچر دینے مدراس جانا ہوا ۔ مسجد مزار بحر العلوم کے پائیں میں خود بھی جگہ پائی ۔ کتبہ اور تربت بڑے ہی خوشنما نظر آئے ۔ کتنی ہی زبانوں سے مرحوم کے حق میں دعائے خیر نکل رہی ہوگی ۔

سرکاری ملازم ہو کر اور پوری طرح محتاط و غیر جانبدار ہو کر ، اپنے ہم ملتوں کی پوری طرح خدمت کیے جانا میں نے ان افضل العلماء کے علاوہ تین صاحبوں کا اور بھی شعار دیکھا ہے ۔ اللہ ان چاروں صاحبوں کا سبب مغفرت اس ایک خصلت کو اگر بنا دے ، تو ذرا بھی حیرت نہ ہوگی ایک تو یہی عبد الحق کرنولی ، دوسرے غلام محمد مرحوم گورنر جنرل پاکستان (سابق فنانس منسٹر حیدرآباد) تیسرے سید صدیق حسن صاحب مرحوم (ممبر بورڈ آف ریوینو ۔ یو ، پی) اور چوتھے سید ظہور الحسن مرحوم (ریوینو سکریٹری ۔ یو ۔ پی)

ایک پیکرِ عفّت

(متوفیہ ۱۹۶۹ء)

حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا راز[1]
آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو!

اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی
کہ تم ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی[2]

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے[3]

---

[1] تاریخ عقد۔ ۲ر جون ۱۹۱۶ء

[2] تاریخ وفات۔ ۲ر جنوری ۱۹۶۹ء

[3] ساری عمر کے بعد۔

غازی مسعود

(متوفی ۱۹۶۷ء)

جون ۱۹۰۸ء تھا کہ ہم ایک دوسرے سے ملے۔ میں دسویں درجے کا اسکولی طالب علم تھا اور وہ ندوے کے کسی درجے میں پڑھ رہے تھے۔ گرمیوں کی بڑی تعطیل میں میں دریاباد آیا ہوا تھا۔ اور طلبۂ ندوہ کا ڈپوٹیشن دریاباد میں تحصیل چندہ کو آیا ہوا تھا۔ علی گڑھ کی تقلید میں طلبہ کا ڈپوٹیشن اب فیشن میں داخل ہوچکا تھا۔ اٹاوہ، ندوہ سب یہی کرنے لگے تھے، اور اصطلاح ڈپوٹیشن ہی زبانوں پر تھی "وفد" کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ندوے سے چندہ لینے یہی دو لڑکے آئے۔ ایک یہ دوسرے مولوی عبدالباری ندوی، وہ افسر تھے اور یہ ماتحت۔ یہ بھی رہنے والے انھیں کی طرح ضلع بارہ بنکی کے تھے، وہ گدیہ کے تھے اور یہ قصبہ مسولی کے قریب ایک گاؤں بھیارہ کے، بھیارہ قدوائیوں کا مرکز تھا۔ اور ان کے نسب کا سلسلہ بھی کسی طرح اسی خاندان سے جڑا ہوا تھا۔

اس وقت خوش رو، سبزہ آغاز نوجوان تھے، اور مدتوں خوش روئی کا یہی عالم قائم رہا۔ ذہین، طبّاع، حاضر جواب، شوخ مزاج تھے۔ آگے چل کر شہرت علم وفضل میں نہیں، عملی کمالات اور علم مجلس میں حاصل کی۔ کھاتے پیتے گھر کے تھے۔ ایک حد تک شوقین مزاج، کھاتے اور کھلاتے۔ آج اِس کی دعوت، کل اُس انتظام میں پیش پیش ہیں۔ ندوہ میں پارٹیاں آئے دن ہوا کرتیں، ہر بارات کے نوشہ یہی۔ انتظام کا سہرا انھیں کے سر۔

ٹینس بھی اچھا کھیلنے لگے۔ چڑیوں اور جانوروں کے شکار کرنے اور کرانے میں بھی دخل باغبانی اور کاشتکاری دونوں میں نیم ماہر۔ انھیں علمی کمالات کی شہرت انھیں دربار شبلی تک

لے آئی اور بہت جلد ان کا شمار بطور مُقرّب سلطان کے ہونے لگا۔ اسٹرائک یہ جب چاہیں کرادیں اور پھر اسٹرائک کے روکنے اور اس کا زور توڑنے کے گرُ بھی انھیں از بر، دارالمصنفین کا جو نقشہ اخیر زندگی میں مولانا شبلی نے بنایا اس کے علمی شعبے کے سربراہ جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی رہے اسی طرح اس کے علمی و انتظامی شعبے کے مدارالمہام یہی مسعود ندوی۔ ہم بے تکلف نیازمندوں کی زبان میں سالار مسعود غازی!

بڑے چاق و چوبند، بڑے مستعد و کارگزار، ہر فن و شعبے میں دخیل، صنعت کاری میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں۔ کم سے کم دو مسجدیں، ایک دارالمصنفین کی دوسری ندوہ کی صناعی و صنعت کاری کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ!۔۔۔۔۔ شاہجہاں کے عہد میں یہ کہیں ہوتے تو عجب نہیں کہ میر تعمیر کے مرتبے تک ترقی کر کے پہنچ جاتے! تحریک ترک موالات میں جب گاندھی کے چیلے بن کر وہ اُٹھے، تو اعظم گڑھ کے ضلع میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں چرخے چلوادیے۔ اور چندے کی تعداد جوڑ بٹور کر جو بھی، اس کا شمار ہی نہیں۔

ان کے قدرداں و قدر شناس دو شخص ہوئے، ایک نواب صدر یار جنگ شروانی علی گڑھ والے، دوسرے بابائے خلافت شوکت علی۔ انگریزی حکام سے بھی ربط ارتباط دو راستوں سے پیدا کرلیا۔ ایک شکار کھلانے کی راہ سے دوسرے ٹینس کے گیند بلّے سے۔ دارالمصنفین کی دنیا میں سکّہ انھیں کا چلتا تھا۔ حکومت انھیں کی تھی۔ گو ضابطے سے سب سے بڑے سید سلیمان تھے۔

ایک زمانے تک حضرت تھانوی کے بڑے مخالف رہے، پھر جب سن اُترا اور زمانے کی گردشوں نے ہر طرح چور اور مجبور کردیا اور اقبال مندی نے یکسر ساتھ چھوڑ دیا تو دل میں انابت کی لو لگی اور تھانہ بھون کے آستانہ پر لائی۔ حضرت سے بیعت ہی نہیں ہوئے بلکہ درجۂ دوم کی خلافت بھی حاصل کرلی۔ (مجاز بیعت درجۂ اول کا خلیفہ ہوتا اور مجاز صحبت درجہ دوم کا)

غازی صاحب طالب علمی میں سید صاحب کے جونیر تھے، تعلقات الفت و مروّت اس وقت سے تھے۔ دارالمصنفین قائم ہونے پر یکجائی ہوئی اور دوستی و یک جہتی سالہا سال قائم رہی،

ایسی کہ دوسروں کے لیے مثال۔ مسلمانوں کی قسمت نے وہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ پہلے ہلکی خانگی شکر رنجیاں ہوئیں، بڑھتے بڑھتے نوبت بدخواہی و مخاصمت کی آگئی (جبکہ دونوں بیعت ایک ہی شیخ حضرت تھانوی سے ہو چکے تھے اور خلافت بھی اپنے اپنے درجے کی مل چکی تھی) اور وہ سب کچھ پیش آکر رہا، جسے ہرگز کسی مسلمان کے درمیان نہ ہونا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ ایسے رفیقان قدیم اور ایک ہی شیخ کے تربیت یافتوں میں!

——— غازی صاحب کی اخیر زندگی مہینوں نہیں برسوں بڑی تلخ گزری۔ ایک لڑکی کی طلاق ہوئی، بیمار بیوی کا انتقال ہوا۔ اپنی معذوری کی نوبت رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچی کہ چلنا الگ رہا، دونوں پیر ٹکا کر کھڑے تک نہیں ہو سکتے تھے۔ دو طاقتور آدمی بغل میں ہاتھ دے کر زمین سے اٹھا لیتے تھے۔ گویا کسی بے جان چیز کو مثل بھاری گٹھری کے ٹانگے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح لٹکائے ہوئے دوسری جگہ رکھ دیتے تھے! حواس بھی بڑی حد تک غائب! کہاں ہر وقت ایک دربار لگا رہتا تھا، کہاں اب کوئی بات پوچھنے کا بھی روادار نہیں۔ عجب عبرت کا منظر تھا، کوئی روایت بیان کرتا تو یقین نہ آتا اور اسی حالت میں وقت موعود آگیا، انا للہ۔

بدایونی

(ہم نام نامور)

متوفی ۱۹۳۱ء

قدیمی مخلصوں میں میرے ہم نام، عبدالماجد بدایونی بھی تھے، بدایون کے مشہور خاندان علماء و مشائخ کے ایک عالم، اور قادری سلسلے کے صوفی۔ علم و فقر دونوں سے زیادہ خوش بیان اور خوش تقریری کے لیے شہرت پائے ہوئے۔ تحریک خلافت کے شباب جوش و بحران کے زمانے میں جگہ جگہ بلائے جاتے اور ہر جگہ گرما گرم تقریر کر کے آتے۔ خلافت کی تحریک سرد پڑ جانے پر آل انڈیا انجمن تبلیغ اسلام سے اسی جوش و سرگرمی کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے

تحریک تبلیغ، آریہ سماجیوں کی شدھی (ارتداد) تحریک کے جواب میں تھی، اور ان تبلیغی اجتماعوں، اور ان کے گشت اور چلّے سے کوئی تعلق نہ تھا جن کا رواج مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک سے کئی سال بعد ہوا۔ محبوب ترین موضوع ان کا ذکر میلاد النبیؐ تھا۔ تقریر بڑی جاندار اور بڑی شاندار کرتے۔ اور گھنٹوں مسلسل اسی موضوع پر بولتے چلے جاتے۔ زبان کی طاقت کے ساتھ ساتھ چشم و ابرو، ہاتھ پیر کے حرکات سے سامعین کو مسحور کر لیتے۔ بلبل کی طرح چہکتے اور شاخ گل کی طرح لچکتے۔

عقائد میں بریلوی حضرات کے ہم آہنگ تھے۔ لیکن تعصب اور تنگ نظری میں ان سے بالکل الگ۔

بڑے بے تکلف آدمی تھے، اور بڑے وسیع المشرب۔ رندوں سے اسی طرح ملتے۔ جس طرح

زاہدوں سے۔ جس کے دوست ہو جاتے اس سے حق دوستی ادا کر کے رہتے۔ اور وضع داری اس زمانے میں بہت بڑی چیز تھی۔ ان کے مزے دار باتوں کی یاد ملنے والوں کو مدتوں تڑپاتی رہی۔

ایک زندہ جنّتی

(متوفی ۱۹۵۷ء)

کوئی درویش نہیں، کوئی عالم فاضل نہیں، انگریزی تعلیم یافتہ اور سوٹ پوش۔ نام نواب جمشید علی خاں، باغپت ضلع میرٹھ کے رئیس۔ مسلمانوں کے ہر کام میں پیش پیش۔ اسسٹنٹ جج کمیٹی کے صدر۔ غالباً سُنّی وقف بورڈ کے بھی صدر۔ صوبہ اسمبلی کے ممبر۔ ادھیڑسن کے ہو چکے تھے۔ لیکن ماں کے ابتک تابعدار اور اپنے کو ماں کا محکوم اور خدمت گزار بنائے ہوئے۔ جیسے بچپن میں کبھی واقعی ان کے محتاج تھے! ماں سے زبان لڑانا الگ رہا، اُلٹے ان کے آگے سر جھکائے ہوئے۔ ان کے اشارے کو اپنے حق میں فرمان سمجھے ہوئے۔ اپنے کپڑوں کی ضرورت ہوتی تو انھیں سے فرمائش کرتے جیسے بچپن میں کبھی کرتے رہتے تھے۔ اور جب ان کا حکم ہو جائے، جبھی کپڑے بناتے! — اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ماں جب کبھی ناخوش ہو جاتیں تو مار تک بیٹھتیں اور یہ اسی طرح چپ چاپ مار کھا لیتے، جس طرح بچپن میں کبھی مار کھا لیتے تھے۔! جواب دینا اور مقابلہ کرنا الگ رہا۔ معصومیت سے سر جھکائے ۳۵، اور ۴۰، اور ۴۵ سال کے سن میں اس طرح مار کھا لیتے جیسے کبھی ۵، ۶ سال کے سن میں کھائی تھی! — ایسی کوئی مثال اس بیسویں صدی میں بھی موجود ہونے کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اور جب یقین آگیا تو دل نے اپنے بے تامل فتویٰ دے دیا کہ ایسے شخص کے جنتی ہونے میں کیا شک وشبہ ہو سکتا ہے! اس ارشادِ مصطفٰے پر اپنا ایمان برائے العین ثابت کر دیا کہ

"جنت، ماں کے قدموں کے نیچے ہے"

دوسری بشری لغزشیں، کمزوریاں، خطائیں سب اس ام الحسنات دام الفضائل

کے طفیل میں عجب نہیں کہ معاف ہو جائیں گی اور انشاء اللہ اپنی ماں کا تابعدار جنّت میں آزادی سے دندناتا ہوا جائے گا۔

مرحوم ابھی بوڑھے کہاں ہونے پائے، کہ اجل کا پیام آگیا۔ لیکن یہ بندۂ عاصی ان کے سامنے ان کو زندہ جنتی کے لقب سے یاد کر لیا کرتا تھا۔

مولانا عبدالباری ندوی

(متوفی ۱۹۷۶ء)

شناساؤں اور کرم فرماؤں میں کسی کی بھی دوستی کی عمر اِن سے زیادہ طویل نظر نہیں آتی۔ مجھ سے سِن میں دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے۔ دیر سے دیر ۱۹۰۸ء سے ملاقات ہے اب ۱۹۷۲ء ہے۔ گویا کم سے کم ۶۴ سال دوستی کو ہوئے۔ ایک چھوٹا سا عجوبہ یہ بجائے خود ہے رہنے والے بارہ بنکی ہی کے کسی غیر معروف قصبے یا موضع کے ہیں۔ پیدائش تو شک ہوتا ہے قصبہ کرسی میں ہوئی۔ لڑکپن کا ایک بڑا حصہ قصبہ گدیہ میں گزرا۔ غالباً میری ملاقات اسی زمانے سے ہے۔ وہیں ان کے والد مولوی حکیم عبدالخالق طبیب تھے۔ اور چھوٹے سے تعلقہ گدیہ کے ملازم تھے۔ دینی تعلیم نگرام میں پائی اور پھر عرصے تک ندوے میں رہ کر (اور شاید کچھ دن فرنگی محل میں بھی) ندوے میں مولانا سید سلیمان، مولوی عبدالسلام وغیرہ کے زمانے میں تھے، گو ان سے بہت نیچے۔ مولانا شبلی کے ہاں حاضر باشوں میں تھے، ان سے بہت مستفید ہوئے۔

پہلی ملاقات غالباً بانسہ کے عرس میں ہوئی۔ بانسے والے میرے تو عزیز قریب ہی تھے۔ یہ بھی اس وقت تک وہاں عرس میں کبھی کبھی آجاتے تھے۔ پھر ندوہ کی طرف سے دفد میں دریاباد جون ۱۹۰۸ء میں آئے۔ مجھ سے راہ ورسم قائم ہو گئی۔ میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے آ گیا تھا اور وہ ندوے کے ہوسٹل میں تھے، ملاقات اکثر ہوتی رہتی۔ اور زیادہ تر میرے ہاں آتے، علمی، ادبی، معاشری مذاق کا اشتراک محبت و ارتباط کا باعث ہوا۔ کتاب وہ زیادہ نہ پڑھتے (کتاب کا کیڑا تو میں کُڑھ مغز ہی تھا) البتہ ذہانت اور تیزیِ فکر میں یہ بہت آگے تھے۔ میں کتابوں مقالوں کا خلاصہ ان سے بیان کر دیتا اور وہ اس پر بحث شروع کر دیتے۔ اصل موضوع انگریزی فلسفہ، منطق اور

نفیات تھے۔ اور مطالعہ گو باہم لوگوں کا ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ میری تشکیک اور بے دینی بڑھتی رہی، اور یہ بچارے اپنی والی کوشش میری تسکین و تشفی کی کرتے رہتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی کھُلا ہوا دشمن اسلام مل جاتا، جیسے کوئی مشہور پادری اور اس کا مقابلہ ہم دونوں مل کر اسلام کے دفاع میں کرتے۔ میں نے کورس میں عربی لی تھی اور انھیں پرائیوٹ انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ میں نے ان سے عربی کچھ سبقاً سبقاً پڑھی، اور انھوں نے مجھ سے انگریزی۔ مجھے تو عربی کچھ آئی وائی نہیں، البتہ انھوں نے انگریزی مطالعہ بھر کی ضرورت کی سیکھ لی۔ میں نے جب شادی کا ارادہ کیا اور شادی کر بھی ڈالی، تو ان بالکل نجی معاملات گفتہ بہ و ناگفتہ بہ میں بھی میرے رازدار اور شریک کار رہے۔ اور انھیں بھی جو واردات قلب اس سلسلے میں پیش آئے تو ان میں وہ اپنے اعتماد سے مجھے نوازتے رہے۔ لکھنؤ میں میرا قیام مستقل تھا۔ ان کا اکثر باہر رہنا ہونے لگا۔ کبھی اعظم گڑھ کبھی پونا، کبھی بمبئی وغیرہ۔ جب کبھی باہر سے آتے میرے ہی ہاں ٹھہرتے۔ اور میں کبھی کبھی اپنی بدنفسی سے میزبانی کے فرائض بھی ٹال جاتا۔ برسوں بعد جب حج کو روانہ ہوا (۱۹۲۹ء میں) تو یہ بھی مع اپنے والدین اور چھوٹے سے قافلہ کے میرے ساتھ ہی چلے اور ساتھ رہے۔ اسی طرح اپنی پہلی شادی کی تو میرے صلاح و مشورے سے، اور میرے دور کے ایک سسرالی عزیز کے ہاں۔

میری اکثر باتوں پر مجھے بڑے اچھے انداز میں ٹوک دیتے اور میں ان کا احسان مند ہوں کہ بعض خانگی معاملات میں انھوں نے مجھے زیادتیوں سے روکے رکھا۔ اور والد مرحوم کے زمانے میں ان کی نافرمانیوں کی راہ میں بہت دور تک جانے سے باز رکھا۔ اور میں نے اگر ان کی رائے پر عمل نہ کیا ہوتا، تو بڑی خرابیوں میں پڑ گیا ہوتا۔ جولائی ۱۹۲۸ء میں جب ہم تلاش مرشد میں نکلے ہیں اور سہارن پور گئے ہیں تو یہ میرے رفیق طریق تھے۔ ضابطے سے جو تعلق مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہوا اور عملاً جو تعلق اصلاح مولانا تھانوی سے رہا، اس میں یہ میرے ساتھی اور ساجھی رہے۔

دنیا بہرحال دنیا ہی ہے، جنت نہیں ہے۔ یہاں کسی تعلق کو بھی سو فیصدی اور دائمی ہمواری نصیب ہو سکتی ہے؟ بارہا ان سے بھی اختلافات ہوئے، اور شکر رنجیاں بلکہ تلخیاں بھی

بیش آتی رہیں ــــــ جب صحابۂ کرام تک باہم ان بشری لغزشوں سے محفوظ نہ رہ سکے تو ہم گندے بندوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ اخلاص وخُلّت کامل کا ظہور ناسوت میں نہیں، صرف عالم آخرت ہی میں ہوگا۔

ونزعنا ما فی صدورھم من غلٍّ (الاعراف ع ۵) ترجمہ:۔ اور ہم دور کرائیں گے (جنتوں سے) جو کچھ غبار ان کے دلوں میں رہا ہوگا (دنیا میں)

ابتدائی زمانہ تنگدستی کا تھا۔ پھر اوسط درجہ کی فراغت حاصل ہوگئی۔ حیدرآباد جاکر کچھ روز بعد خوشحالوں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۱۸ئہ میں میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتہ تالیف وترجمہ سے رخصت ہوا، تو اپنے جانشینوں کے لیے تین نام پیش کرآیا تھا اس میں شاید پہلا نام انھیں کا تھا۔ یہ شعبۂ فلسفہ میں تعلیم دینے کو بلائے گئے۔ چند سال بعد جب ایک انگریز نگراں مسٹر میکنزی کا دَور دورہ ہوا تو یہ شعبۂ دینیات میں تبدیل کردیے گئے۔ لکھنؤ میں شہر کے کونے پر ایک بڑی سی کوٹھی بنوالی۔ سابقے والوں سے ذرا بنتی کم ہے، اسباب جو کچھ بھی ہوں۔ یہ لکھتے خوب ہیں۔ فکر وفہم حضرت تھانوی سے لی ہے۔ اور انداز تحریر مولانا شبلی سے۔ تعلیمات تھانوی کو بہ سلسلۂ تجدید دین چار جلدوں میں لکھ کر خوب مقبول بنا دیا ہے۔ اور اب اخیر زمانے میں سائنس والوں کی زبان سے خداپرستی کا پیام خوب پھیلایا ہے۔

گراں گوشی تو ہمیشہ رہی۔ اس کا ایک طبّی باعث ممکن ہے کہ لیموں کا زیادہ استعمال ہو۔ اور اب کئی برس سے گراں گوشی بہت بڑھ گئی ہے۔ اور عام صحت بھی خراب رہنے لگی ہے، اور چلنے پھرنے کے تو جیسے ناقابل ہی ہوگئے ہیں۔ اس پر بھی لکھنے کا کام خوب کیے جاتے ہیں ــ افسوس ہے کہ اس پر حضرت تھانوی کے زمانہ میں توجہ نہ کی۔ ورنہ وہ بڑی مدد فرماتے۔ میں اپنی تحریروں میں ان کا اکثر ذکر ایک تھانوی الفکر اور شبلی القلم کے عنوان سے کرتا ہوں۔ اپنی جوانی میں ایک رسالہ مذہب وعقلیات پر بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر خوب لکھا تھا۔ پھر اس کے بعد جیسے لکھنا بھول ہی بیٹھے تھے۔

حضرت تھانوی کو اس کی حسرت ہی رہ گئی۔ اب ان کی وفات کے بعد گویا بڑی حد تک تلافیٔ مافات کر دکھائی۔ خدمت دین کے لئے اللہ ان کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔ ضابطے سے بیعت تو مولانا حسین احمدؒ صاحب سے ہے لیکن تربیت میری طرح انھوں نے بھی حضرت تھانوی سے پائی، اور انھیں نے انھیں خلافت و اجازت بیعت عطا فرما دی ہے۔ سخت افسوس ہے کہ گوناگوں بیماریوں نے انھیں بالکل فریش بنا رکھا ہے۔

مستزاد:۔

۱۹۷۴ء میں میری کتاب معاصرین "صدق جدید" میں قسط وار نکلنا شروع ہوئی اور ابھی مولانا عبدالباری ندوی کی باری آنے نہیں پائی تھی کہ وہ مرحوم ہوگئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء جمعہ کی صبح کو وفات پائی۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ نماز جنازہ جمعہ کی نماز کے بعد ندوۃ العلماء کی مسجد میں ایک مجمع عظیم کے ساتھ ہوئی۔ جس میں طلبۂ ندوہ کی بڑی تعداد اور اساتذہ شامل تھے۔ نماز جنازہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی اور تدفین ڈالی گنج لکھنؤ کے قدیم قبرستان میں ہوئی۔

(متوفی ۱۹۶۴ء)

رہنے والے فرید آباد (نواح دہلی) کے۔ فرید آباد وہی جہاں کے مرزا قتیل مشہور ہوئے ہیں۔ (صاحب رقعاتِ مرزا قتیل) ان کی ایک حقیقی خالہ دریاباد میں بیاہی ہوئی تھیں مرزا یوسف بیگ مرحوم کو۔ غالباً ۱۹۱۴ء تھا جب ان سے ملاقات لکھنؤ میں ہوئی (اور وہ زمانہ میرے مستقل قیام لکھنؤ کا تھا) ظفر الملک علوی کاکوری ماہنامہ الناظر نکال رہے تھے۔ میں اس میں مقالہ نگاری کیا کرتا تھا۔ یہ آئے اور وہیں مقیم رہے۔ ایک بار پہلے آگرے میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ بابائے اردو عبدالحق کے ساتھ ساتھ تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اس سال وہیں ہوا تھا۔ کانفرنس تعلیم یافتہ مسلمانوں کا سالانہ میلا تھا۔

پھر حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس کا پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ تھا۔ اس میں یونیورسٹی کے لئے کتابیں تیار ہو رہی تھیں۔ اس میں فلسفے کے شعبے میں میں بلایا گیا تھا۔ اور تاریخ کے شعبے میں سید ہاشمی (سیاسیات و تاریخ کے شعبے میں قاضی تلمذ حسین گورکھپوری۔ ایم اے علیگ) یہ زمانہ ستمبر ۱۹۱۷ء سے لے کر آخیر جولائی ۱۹۱۹ء تک رہا۔ ایک کمرہ میرا تھا، ایک ہاشمی صاحب کا۔ کام بھی ہوتا تھا، اور خوش گپیاں بھی۔ عقائد و خیالات میں بُعد المشرقین تھا۔ میں تشکیک و لاادریت اور الحاد کے مرض میں مبتلا تھا۔ ہاشمی صاحب اس وقت بھی پورے مذہبی تھے، بلکہ شاید کسی بھوپالی نقشبندی شیخ کے مرید بھی تھے۔ خلوص فریقین کی طرف سے تھا، اس لئے کبھی بحث و مباحثے میں نوک جھونک ہو کر رہتی نوبت جنگ و جدال کی نہیں آتی۔ زندہ دلی اور طباعی، ہاشمی کے روئیں روئیں سے ٹپکتی تھی۔ لکھتے خوب تھے، بالکل

دلّی والوں کے رنگ میں۔ مزاج و خصائل، وضع و شمائل تک میں دہلوی ادیبوں کا رنگ ٹپکتا تھا۔ کتابیں تاریخ کی لکھتے لیکن آدمی تاریخ کے نہیں، ادب و انشاء کے تھے۔ میں کہا کرتا تھا کہ "قدرت نے آپ کو ادیب بنا کر بھیجا تھا، زبردستی اپنے کو مورخ بنا لیا"۔ نچلے بیٹھا ہی نہ جاتا تھا۔ ابھی کسی پر فقرہ چست کیا ابھی کسی روتے کو ہنسا دیا۔ پاکستان بننے پر وہیں منتقل ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں جب کراچی و لاہور اور اخیر ۱۹۵۶ء میں جب صرف لاہور گیا، تو دونوں بار ملاقاتیں رہیں۔ مذہب اور عبادت گزاری کے ساتھ ساتھ ترقی، زندہ دلی اور ہنسوڑپن میں بھی پائی، لکھتے بڑی تیزی سے تھے۔ گویا مشین ہاتھ میں لگی ہوئی ہے۔ اور خط بھی ان کی طبیعت کی طرح بڑا پاکیزہ تھا۔ بابائے اردو عبدالحق کے خاص منظور نظر تھے۔ میں نے جب پہلی بار دیکھا ہے، تو داڑھی نکل آئی تھی۔ اس لیے امرد پرستی کی بدگمانی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اسلام کے ہی بعض معلوم و معروف فرقوں سے بہت خفا رہتے تھے۔

سیاسی خیالات میں انگریزوں سے بیزاری شروع ہی سے تھی، غالباً ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ سے بی، اے کر رہے تھے۔ پرنسپل اس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد تھے۔ انھیں کے عہد میں کالج سے اخراج ہو گیا تھا۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں یورپ بھی کسی تقریب سے ہو آئے تھے۔ اللہ تربت ٹھنڈی رکھے۔

پریم چند

(متوفی ۱۹۳۶ء)

اصلی نام تو شاید دھنپت رائے تھا۔ اطراف گورکھپور کے کہیں کے رہنے والے تھے قلمی نام پریم چند رکھا۔ اور یہ اتنا مشہور ہوا کہ اصلی نام کو لوگ بھول بھال گئے۔ مضمون نگاری بلکہ افسانہ نگاری کے ذریعہ سے ملک سے روشناس ہوئے۔ پہلے محکمۂ تعلیمات میں شاید سب ڈپٹی انسپکٹر تھے۔

ترک موالات کی طوفانی تحریک میں سرکاری نوکری چھوڑ کر دیش سیوک بلکہ گاندھی سیوک ہو گئے۔ ناول پر ناول لکھنا شروع کر دیے۔ چوگان ہستی، میدان عمل، بیوہ، وغیرہ۔ دیش بھگتی کے ساتھ ساتھ شخصی، انفرادی۔ اخلاق کی اصلاح بھی ہمیشہ مدنظر رہی۔ جھوٹ آوارگی، بدچلنی، تعصب، بددیانتی، کے خلاف اور شرافت، رحم دلی، بے تعصبی، دیانتداری کی حمایت میں وعظ، افسانے کے پیرائے میں ہمیشہ جاری رہا۔

عام طور پر ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں نے شہری زندگی کو اپنا موضوع رکھا ہے اپنے پلاٹ اسی محور کے گرد چکر کھائے ہوئے رکھے ہیں۔ پریم چند نے اس کے برخلاف اصل موضوع دیہاتی زندگی رکھی، اور طبقۂ عوام کو اپنے ہاں خاص جگہ دی۔ زبان ہمیشہ عام فہم سلیس رکھی، گو ان کی زبان دہلی اور لکھنؤ کے معیار پر کبھی ٹکسالی نہ ہو پائی۔ درد و گداز بھی قلم کا خاص جوہر تھا۔ ایک مرتبہ میرا مقالہ "اردو کا بدنام شاعر" کے عنوان سے نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہر عشق پر پڑھا گیا۔ حاضرین میں پریم چند بھی تھے، جب مقالے کا دردناک حصہ شروع ہوا تو پریم چند کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کچھ روز بعد میرے ان کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ جب ان کا ناول چوگان ہستی نکلا، تو میں نے خوش ہو کر اُن سے کہا کہ

" اس کا مصنف مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا " تو اس پر ہنسا کئے اور بولے تو یہ بولے کہ " کیا ہندو کیا مسلمان سب ایک ہی ہیں ۔"

بڑی حد تک گاندھی جی کے پیرو تھے ۔ تشدد ، مار پیٹ ، بلوہ فساد کے آدمی کبھی نہ رہے ہمیشہ انسانیت و شرافت ہی کی خدمت و نصرت کیا کیے ۔

اردو کتابوں سے کچھ زیادہ نفع نہ ہوا ، مجبوراً ہندی میں لکھنا شروع کیا ، اور اس سے مالا مال ہو گئے ۔ ابھی جوان ہی تھے ، اور بہ ظاہر بڑی اچھی صحت والے ، کہ وقت اُسی وقت آ گیا ۔ اور اچھا ہی ہوا کہ سفاکی ، درندگی ، لوٹ مار کے نظارے اپنے ملک کے بھائیوں پر دیکھنے سے قبل دنیا سے رخصت ہو گئے ۔

ہوش یار جنگ

(متوفی ۔ ۱۹۵۵ء)

نام سید ناظر الحسن تھا، زبانوں پر صرف تخلص اور وطن چڑھا ہوا تھا۔ ہوش بلگرامی۔ مولد اودھ کا مشہور قصبہ بلگرام تھا۔ دور کی قرابت مشہور خاندان بلگرامی مقیم حیدر آباد کے مشہور ترین فرد نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سے رکھتے تھے۔ شعر کم کہتے تھے۔ مگر شہرت تخلص شاعرانہ ہی سے تھی۔ جیسی نثر نویس عبد الحلیم شرر کی ہے اور دوسرے نثر نویس رتن ناتھ کی سرشار سے۔ میں حیدر آباد ستمبر ۱۹۱۷ء میں پہنچا۔ یہ اس وقت وہاں سے ماہ نامہ ذخیرہ نکال رہے تھے چند ہی روز میں مجھ سے خلا ملا ہو گیا۔ ان کے ہاں کی دعوتیں اس وقت کی یاد ہیں۔

کچھ ہی روز بعد عتاب شاہی کی زد میں آ گئے، اور حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ پہلے بھوپال رہے پھر رامپور آ کر جم گئے۔ ایک بار شاید ۱۹۲۲ء میں دہلی جا رہا تھا۔ راستہ مراد آباد و رامپور کا اختیار کیا اور انھیں کا مہمان رہا۔ یہ خود بھی ایک دو بار لکھنؤ آئے اور قیام غریب خانے ہی پر فرمایا (میں اس وقت تک لکھنؤ ہی میں رہتا تھا) فارسی کے استاد سید اولاد حسین شاداں سے ملایا پھر ایک بار حیدر آباد کا قصد کیا، کب تک اس کی جدائی کو برداشت کرتے۔ اب کی مجھے ہمراہ لیا۔ اور درجہ اعلیٰ کا ٹکٹ میرے لیے خرید دیا۔ پہلے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی مصاحبت اختیار کی اور پھر رفتہ رفتہ سرکار آصف جاہ میں بھی ملازم و مصاحب ہو گئے ـــــ مہاراجہ کے دربار میں پہلے بھی رہ چکے تھے، اور اب کی مجھے بھی لے جا کر مہاراجہ سے ملایا۔ مہاراج کے حسن اخلاق، شائستگی و شرافت کے شہرے پیشتر بھی سن چکا تھا۔ ملا، تو "دید" کو "شنید" سے بھی بڑھ کر پایا۔ تواضع، انکسار، خرد نوازی کے ایک زندہ پیکر تھے۔

ہوش اور جو کچھ بھی ہوں، بڑے اچھے مصاحب تھے، اور میرے حق میں تو خیر مجسم۔ میرا غائبانہ تعارف وزیر اعظم سر مرزا اسماعیل (نواب معین الملک) سے انھوں نے کرایا۔ اور مجھے جو علمی پنشن ۱۹۱۹ء سے ملتی چلی آرہی تھی، اس کو ۱۹۴۹ء میں دو سو تک پہنچا دیا ـــــ اس قسم کا کرم میرے ساتھ مخصوص و محدود نہ رہا۔ فاضل بزرگ مولانا سید سلیمان ندوی کی ذات کے لئے بھی علمی پنشن انھیں نے منظور کرائی ـــــ اور یہ سُن لیجئے کہ ہوش سنی المذہب نہیں بلکہ فرقۂ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آگے چل کر "ہوش یار جنگ" بھی ہو گئے (میں ہوش ذی ہوش" شروع سے کہتا چلا آرہا تھا) ہوش یار جنگ حیدر آباد سے دو بار لکھنؤ آئے۔ اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے۔ میں ان کی آمد کی خبر پاکر دریاباد سے لکھنؤ آگیا۔ دونوں بار مجھ سے ملنے خاتون منزل (گولہ گنج) آئے اور دونوں بار میری نواسی کے ہاتھ میں (جو ابھی بچی تھی) عنہ عنہ کے نوٹ میری ہاں ہاں کرنے کے باوجود، دے گئے۔ اس وقت کے دس آج کم سے کم ۵۰ کے برابر ہوئے۔

ذخیرہ تو مدت ہوئی بند ہو چکا تھا۔ الگ سے لکھتے لکھاتے رہے اور لکھنے کا سلیقہ اچھا خاصا رکھتے تھے۔ ایک مثنوی ہے۔ اور ایک کتاب تنقید ادب کے سلسلے میں۔ اور آخر میں ایک ضخیم کتاب مشاہدات لکھ ڈالی، جس پر بڑی لے دے ہوئی۔ میری ہوا خواہی ہر قدم پر ملحوظ رکھتے۔ بالکل آخر زمانے میں اعلیٰ حضرت ناخوش ہو گئے تھے۔ انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ۱۹۵۵ء میں ہوا اور کہا جاتا ہے کہ زبردست سیاسی مخالفت اور اعلیٰ حضرت کی ناخوشی کا صدمہ اس مرگ ناگہانی کا سبب ہوا۔ بہر حال مجھے صدمہ ایسا ہی ہوا جیسے کہ ایک مخلص دوست کا ہونا چاہیے۔ کئی سال بعد جب میرا حیدر آباد جانا ہوا تو پتا لگا کر ان کی تربت پر گیا، فاتحہ پڑھا، اور انھوں نے جو مسلسل عنایتیں میرے حال پر رکھی تھیں ان کا واسطہ دے کر ان کے حق میں دعائے خیر کی۔

مودودی صاحب

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام سب سے پہلے اس وقت سننے میں آیا جب وہ جمعیتہ العلماء کے اخبار الجمعیتہ ہفتہ وار (دہلی) میں ایڈیٹر ہو کر آئے۔ اور پھر چند سال بعد دکن جاکر وہاں سے اپنا ماہ نامہ ترجمان القرآن نکالا۔ "الجہاد فی الاسلام" کے عنوان سے ان کے پُرزور اور دلنشیں مقالے الجمعیتہ میں عرصے تک نکلتے رہے تھے اور یہی آگے چل کر ایک کتابی صورت میں مرتب ہو کر شائع ہو گئے۔ ان کے قلم کی روانی نے کتاب نویس کو ایک فاضل کی شکل میں پیش کر دیا۔ مضمون پر مضمون، مقالے پر مقالے نکلتے رہے، خصوصًا "پردہ" اور "سود" پر اور اسی طرح کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ـــــ لکھنے والا اہل نظر کو ہر طرح ہونہار ہی نظر آیا۔

کچھ روز بعد قلم میں بجائے اعتدال، توازن و متانت کے تشدد اور کٹرپن کے اثرات نظر آنے لگے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے لکھنے والا محض مقالہ نگار یا مصنف ہی نہیں، بلکہ ایک مستقل پارٹی یا ٹولی (حزب) کا لیڈر رہے، اور اپنا ایک جتھا بنا لینا چاہتا ہے۔ "اجتہاد" کے قدم بھی تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ اور مودودی صاحب ہندوستان سے منتقل ہو کر پٹھان کوٹ (پنجاب) پہنچ گئے۔ اور ایک مخلص صاحب خیر نے اپنی کئی ایکڑ زمین اسلام نگر یا دارالاسلام بسانے کے لئے دے دی۔ باتیں اب بھی بہت سی کام کی کرتے رہے، لیکن جو جو عیب اکثر لیڈروں اور جماعتی کارکنوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان میں بھی پیدا ہو گئے۔ اور وہ محض نظریاتی مسائل میں نہیں بلکہ عملی سیاسیات میں بھی پورا حصہ لینے لگے۔

تصنیفی کام بھی تیزی سے جاری رہا، خصوصًا ان کی تفسیر تفہیم القرآن، جسے ان کا شاہکار کہنا چاہیے تیار ہو گئی۔ خیر کا ذخیرہ یقینًا بڑھتا رہا لیکن ساتھ ہی اس کے جوش کا ذخیرہ بھی انکے

قلم سے نکلتا رہا وہ بھی کچھ ایسا کم نہ رہا۔ "جماعت" ان کی جماعت اسلامی کے نام سے موسوم ہوئی اور ذہنیت اس کی خوارج کی سی پیدا ہو گئی۔ لچک یعنی خود تنقیدی ان کے قلم سے رخصت ہو گئی اور ملی اور سیاسی معاملات میں عجب عجب رائیں دینے لگے۔ دو باتیں ان کی کسی طرح بھلائے نہیں بھولتیں اور ان کا یقین کر لینا بھی ان کے سابق مخلصوں اور قدیم نیازمندوں کے لیے آسان نہیں۔

ایک تو جب صدر پاکستان کے الیکشن کا مسئلہ چھڑا، اور سردار ایوب خاں (صدر پاکستان) سے خفا ہوئے تو فرما دیا کہ ایک طرف ان میں کوئی خوبی اس کے سوا نہیں کہ وہ مرد ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابل مس فاطمہ جناح ہیں جن میں کوئی برائی نہیں سوا اس کے کہ وہ عورت ہیں! —— زبان کی اس درجہ بے احتیاطی بجائے خود ایک قہر الٰہی ہے، اور اللہ اپنے اس قہر سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

دوسرا معاملہ وہ ہے جو انھوں نے غلاف کعبہ تیار کرا کے پاکستان کے ہر شہر میں اس کی زیارت اس طرح کرائی، جیسے روضے والی جمنیں اپنے اپنے روضوں کی کراتی رہتی ہیں۔ اور ایک شدید بدعت کی ترویج میں پوری سرگرمی دکھادی! یہ اس طرز عمل کی مثالیں ہیں جو کسی طرح میرے حلق سے نہیں اترتیں۔ اور کوئی تاویل مجھ سے بن نہیں پڑی۔ یوں الگ سے ان کی جماعت بہت سے کار خیر پاکستان میں بھی کر رہی ہے اور ہندوستان میں بھی۔ بلکہ ہندوستان میں پاکستان سے کہیں بڑھ کر، لیکن جو ساکھ مولانا مودودی نے اپنے ہاتھوں اپنی بگاڑ رکھی ہے، اس کا کوئی علاج نہیں، تحریروں میں وہی اکڑ برابر جاری ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا اپنے سے کسی غلطی یا لغزش کے صدور کا امکان ہی نہیں سمجھتے اور نہ آج تک کوئی نظیر ایسی یاد پڑتی ہے کہ مولانا نے بے شمار مسائل میں اپنی غلطی کسی ایک مسئلے میں تسلیم کی ہو۔ زبان کی بے احتیاطیوں سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت یونسؑ انبیائے کرام تک کے باب میں پرہیز نہ رہ سکا گویا اس کا احساس ہی نہیں باقی رہا ہے کہ ان کے قلم کو کبھی بھی ٹھوکر لگ سکتی ہے!

باقی سیاسیات کو چھوڑ کر جو کچھ خدمت دین کی زبان و قلم سے وہ خود کر چکے ہیں یا ان کی

جماعت کر چکی ہے اس سے انکار ممکن نہیں، اور اُن کی تفسیر تفہیم القرآن کا نام رہتی دنیا تک انشاء اللہ رہے گا۔

اُن کی جماعت کے بہترین و مخلص ترین علمی رکن شاید مولوی مسعود عالم ندوی بہاری ثم پاکستانی تھے۔ ان کی وفات کا صدمہ آج تک دل کو ہے۔ اور بھی متعدد لوگ ان کی جماعت کے بہترین و مخلص ترین خادم دین ملک کے ہوئے ہیں۔ اور بحیثیت مجموعی ان کی خصوصاً ہندوستانی جماعت بڑا کام کر چکی ہے۔

امین الحسن بسملؔ موہانی

(متوفی ۱۹۴۲ء)

میں ابھی لکھنؤ ہی میں تھا اور حیدرآباد نہیں گیا تھا، میرے عزیز اور دوست ممتاز میاں بانسوی کے پاس ہر سال عرس بانسہ کے موقع پر شروع شوال میں حیدرآباد سے ایک گہرے معتقد آتے رہتے تھے۔ بڑے باغ و بہار، میاں صاحب نے مجھ سے بھی ملاقات کرادی، مجھ سے بھی وہی مخلصانہ دلچسپی لینے لگے۔ نام سید امین الحسن بسمل موہانی، حیدرآباد میں کسی اچھے عہدے پر تھے، اور ان سے ملاقات لکھنؤ یا بانسہ میں ہر سال ہوتی رہتی۔

جولائی ۱۹۱۷ء میں میرا تقرر بہ طور مترجم منطق و فلسفہ کے، عثمانیہ یونیورسٹی کے پیش خیمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ میں ہوا۔ طلبی تار پر ہوئی۔ اور میں اخیر اگست میں حیدرآباد روانہ ہوگیا تنخواہ تین سو ماہوار سے شروع ہوئی۔ میں بسم اللہ کی گنبد میں پلا ہوا لکھنؤ سے باہر کبھی نکلا ہی نہ تھا (علی گڑھ کے چند ہفتے کے قیام کو مستثنا کرکے) چہ جائیکہ حیدرآباد جیسے دور دراز مقام پر جانا! میرے ایسے شخص کے لیے گویا سفر سائبیریا یا جنوبی امریکہ کے کسی علاقے کا تھا! —— خدمت گار ایک چھوڑ دو موجود! —— خیر پہنچا، اور انھیں امین الحسن کے ہاں اترا۔ ممتاز میاں نے انھیں کو ایک خط لکھ دیا تھا۔ قیام ایک دن نہیں، کم سے کم چار ہفتے تو انھیں کے ہاں رہا۔ مہمانداری، وہ بھی پورے تکلفات کے ساتھ، تین تین آدمیوں کی ان کے سر! ایسی ایسی خاطریں کیں، کہ گھر میں بھی ممکن نہ تھیں۔

شادی کو ابھی ۱۴، ۱۵ مہینے تو ہوئے تھے، بیوی، محبوب بیوی سے اتنی جدائی، معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کی ہوگئی، مہینہ بھر، خدا خدا کرکے کٹا۔ بیوی صاحبہ عزیزوں کے ایک چھوٹے

سے قافلے کے ساتھ پہنچیں۔ اور اب میں نے کرایے کا مکان لے کر الگ رہنا شروع کیا۔ لیکن
نیم مہمان تو کہنا چاہیے کہ انھیں بسمل صاحب کا رہا۔ جتنے دن حیدرآباد کا قیام مقدر تھا، یعنی کوئی
۱۱ مہینے، میری ہر ضرورت کے رفع کرنے کی فکر اس مرد خدا نے اپنے سر رکھی! گویا ایک دایہ کسی
بچے کو اپنی خبر گیری میں لیے ہوئے ہے! کبھی یہ بھی ہوتا کہ شام کو مجھے تفریح کے لئے اپنی گاڑی پر
ساتھ لے لیا۔ اور بہانے بہانے کسی بڑی دوکان پر جا اُترے اور کن کن ترکیبوں اور ترغیبوں
سے مجھے میری شیروانی کے لئے کپڑا خرید دیا!

بڑے ذہین، طباع، زندہ دل، مہذب، شائستہ، علم مجلس کے ماہر، ہر وقت ہشاش
بشاش رہنے والے۔ لڑکپن میں قیام فرنگی محل اور بانسہ میں برسوں رہا۔ خود موہان بھی اودھ
ہی میں ہے اور پھر یہ تو کہنا چاہیے کہ نم لکھنوی اور نم حیدرآبادی بھی ہو گئے تھے۔ میرے بڑے
مزاج شناس اور خوب مانوس ہو گئے۔

شعر و سخن کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ حضرت داغ سے صحبتیں رکھے ہوئے۔ شاگرد بھی غالباً
انھیں کے۔ عربی اور فارسی استعداد پوری رکھتے تھے۔ سینما اور تھیٹر کے شیدائی۔ میرے الحاد کا وہ
دور شباب تھا اور یہ بے چارے ٹھیٹھ مذہبی بیرزادوں کی قسم کے عقیدے رکھنے والے۔ خدا
جانے دل پر کیا جبر کر کے مجھ سے اتنی دوستی اور ہوا خواہی کو قائم رکھا۔ مدتوں نواب سالار جنگ
کی اسٹیٹ کے ناظم رہے۔ پھر واپس سرکار آصفیہ میں آگئے۔ اور شاید مجسٹریٹی کے عہدے پر
فائز تھے۔ بڑے بارباش، سیر و تفریح کے عادی، علم مجلس میں برق، اونچے اونچے حلقوں میں
رسائی رکھتے۔ ابھی پنشن نہیں ہوئی تھی اور بوڑھے نہیں ہوئے تھے کہ وقت موعود آگیا۔ ہائی
بلڈ پریشر میں چٹ پٹ ہو گئے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ حیدرآباد ان کے بعد میرے لیے گویا سونا ہو گیا۔
گیا تو بڑی حسرت سے ان کی قبر کی زیارت کی۔ حیدرآباد جانے کا اتفاق بارہا ہوا تھا، تقریباً ہر
مرتبہ قیام انھیں کے رہا۔ وہی ... نوازی، وہی خاطر داری جو اوّل دن تھی آخر تک رہی اور انکی وجہ
سے سارے موہانی میرے عزیز ہو گئے تھے۔ اب انشاء اللہ جنت ہی میں ملاقات ہو گی۔

مہرؔ و سالکؔ

(متوفی (۱) ۱۹۶۲ء (۲) ۱۹۶۳ء)

پنجاب کے مولوی غلام رسول مہرؔ، بی۔اے مولانا ابوالکلام کے خصوصی معتقدوں میں تھے بلکہ شاید باضابطہ بیعت میں بھی داخل ہو چکے تھے۔ لیکن باوجود اس شدت اعتقاد کے، ہم لوگوں سے بھی پوری رواداری برتتے، اور مجھ سے ذاتی تعلقات بڑے شیریں و خوشگوار تھے۔ بلکہ سیاست میں ایک مدت پیرو مولانا محمد علی کے رہے۔ مدتوں مولوی ظفر علی خاں کے روزنامے زمیندار میں رہے، اور کئی سال تک اس کی ادارت کرتے رہے۔ اس کے بعد اُن سے چل گئی اور سالک کو کو اپنے ساتھ لے کر اپنا روزنامہ انقلاب نکالا اور کئی سال تک اسے پوری آب و تاب سے نکالتے رہے۔ طرز انشاء میں جہاں تک عربی الفاظ لانے اور ترتیب اور نشست الفاظ کا تعلق ہے، مولانا ابوالکلام کے کامیاب مقلّد رہے۔

میرے ہم سن تھے، اور مذہبی عقیدوں میں بڑی حد تک میرے ہم خیال۔ البتہ سیاسیات میں انگریزوں سے نفرت و بیزاری میں مجھ سے کہیں آگے بڑھے ہوئے۔ مگر اس انگریز بیزاری کے باوجود مدتوں سیاسیات میں وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات خاں کے ہم آہنگ رہے جو اپنی انگریز نوازی کے لئے بدنام تھے۔ تاریخ، خصوصاً تاریخ اسلام کا مذاق بھی گہرا تھا۔ کتابوں کا مطالعہ وسیع تھا۔ اور ان کے حوالے کثرت سے دیتے رہتے۔ اپنے اخباری مقالوں میں بجائے محض خطابتی نعرے لگانے کے واقعاتی دلائل اور ہوش اور فکر سے کام لیتے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں میرا اُن کا بارہا ساتھ رہا۔ میں مولانا محمد علی کا ایک خادم تھا، وہ پنجابی ٹولی میں تھے۔ علی برادران سے اس ٹولی کی علی العموم سخت مخالفت رہتی، لیکن وہ تشدد آمیز مخالفت سے

مستثنیٰ تھے۔ آخر زمانے میں بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

عبدالمجید سالک ان کے بہترین رفیق قلم تھے، یہ پنجاب ہی کے گریجوٹ تھے۔ ادبیات میں رنگ مزاح کا غالب تھا۔ اور مزاحیہ نوٹ خوب خوب لکھتے۔ مہر صاحب کا بھی ساتھ پورا پورا زمیندار و انقلاب دونوں میں دیا۔ خصوصاً اپنے خصوصی کالم "افکار و حوادث" کے ذریعے۔ بڑے ہی زندہ دل و شگفتہ مزاج تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے اور پڑھنے والوں کو اچھا خاصا ہنساتے رہتے ـــــ ایک کتاب اپنے اخیر زمانے میں تاریخ ثقافت اسلامی پر بھی لکھی۔ ہر طبقے سے گہرے تعلقات رکھتے۔ اور ہر پارٹی میں پوری رسائی رکھتے۔ میں کہا کرتا کہ لاہور جا کر صرف سالک سے مل لینا کافی ہے۔ حکام سرکاری اور پبلک، ادیبوں، شاعروں، صوفیوں سب ہی کی نمائندگی وہی اکیلے کر دیتے۔ اقبال کے خاص عقیدت مندوں میں، اور مذہب کے پورے پابند تھے۔ مہر صاحب کے ساتھ ساتھ سالہا سال مسلم لیگ کا علم لاہور میں بلند کئے رہے۔ اللهم اغفر له وارحمه۔

پنجاب کے پبلک حلقے میں یہ دو میرے خاص مخلصوں میں تھے۔

مُلّا واحدی

(متوفی ۱۹۷۶ء)

مُلا واحدی کا نام برسوں سے سُننے میں آرہا تھا۔ بہ حیثیت خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید اور مُبلّغ اور رفیق و شریک ہونے کے۔

ملاقات غالباً ۱۹۲۳ء کے آخر میں ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء سے مولانا محمد علی نے اپنا روزنامہ ہمدرد دہلی سے ازسرِنو جاری کیا۔ واحدی صاحب اسی کوچہ چیلان میں ہمدرد سے فرلانگ۔ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہتے تھے۔ اس وقت سے میرا دہلی بار بار جانا ہونے لگا، جب ہی سے واحدی صاحب سے پینگ بڑھے۔ جاڑوں کے موسم میں صبح ان کے ہاں نہاری کی دعوت ہوتی تھی۔ دہلی کی نہاری یوں بھی مشہور تھی، واحدی صاحب اس کی مرچ کی تیزی رفع کرنے کو گھر میں ایک بار پھر گھی سے (اور اس وقت تک، خالص گھی نایاب نہیں تھا) بگھار دیتے تھے، اس سے اس کی خوش ذائقگی اور بڑھ جاتی تھی ——

واحدی صاحب کے جوہر اسی وقت سے کھلنے لگے۔ بڑے مخلص، حلیم، خوش تدبیر، متواضع اور بڑی سوجھ بوجھ کے نکلے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب عظیم نے ان کے سے دہلی پرست کے بھی پاؤں دہلی سے اکھاڑ دیے۔ اور وہ دہلوی سے پاکستانی ہو گئے۔ دہلی میں پرانے میونسپل کمشنر تھے۔ اور اپنے حلقے کے مسلمانوں ہی میں نہیں، ہندوؤں میں بھی خوب مقبول رہے۔ دہلی کی اینٹ اینٹ سے انہیں وابستگی اور محبت تھی، خدا جانے کن مجبوریوں سے انھوں نے وطن چھوڑا ہوگا اور وطن چھوڑتے وقت ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

پاکستان جا کر اُن کے قلم میں مزید توانائی آ گئی اور ترانائی ہی نہیں رعنائی بھی۔ خوب خوب باتیں کام کی لکھنے لگے، دنیا و آخرت دونوں میں کام آنے والی۔ نصیحت کی باتیں۔ بڑوں اور چھوٹوں، مردوں اور عورتوں سب کے لئے اور بڑے ہی دلچسپ، اور شیریں انداز میں، خشکی کا نام و نشان نہیں۔ گویا شیخ سعدی گلستاں لکھ رہے تھے! زبان دہلی کی ٹکسالی۔ اور انداز بیان دلفریب و دل گداز دونوں۔ ایک سے زائد پرچے بھی نکالے۔ گو سب بند ہو گئے۔ اور پاکستان کی ڈاک تو ادھر چار برس سے بند ہے۔ ان کے مضمون ماہنامہ منادی (دہلی) میں نظر آ ہی جاتے ہیں۔

ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں میں ہونا چاہیے۔ مگر بدقسمتی سے نہ وہ کسی پارٹی میں شامل اور نہ کسی تاریخ ادب کے صفحات میں ان کا نام آتا ہے، یہ بڑی حق تلفی ان کی ہو رہی ہے، اور وہ یقیناً مظلوموں میں ہیں ـــــــ مظلوم ان سے بھی بڑھ کر خواجہ حسن نظامی دہلوی اور آغا حیدر حسن دہلوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بھی تھے۔ زبان ان سب کی سند، اور ان کا ہر قول انشا پردازی کے دربار میں مستند ہے۔

خدائے واحد واحدی کا دم قائم رکھے، دین و اخلاق دونوں کی خدمت وہ اپنے میٹھے بولوں سے کر رہے ہیں، وہ کچھ تھوڑی نہیں۔

گیلانی

مولانا مناظر احسن

(متوفی سنہ ۱۹۵۶ء)

نام دیوبند کے سلسلے میں عرصے سے سُن رہا تھا اور دو ایک مضمون بھی پڑھ چکا تھا۔ خیال یہ ہو رہا تھا کہ بڑے مُناظر، جدال پسند اور رجحانات قسم کے عالم ہوں گے۔ پُرانی اصطلاح میں "معقولی"۔ زیارت جب اوّل اوّل حیدرآباد میں ہوئی، مولانا عبدالباری کے ساتھ تو نقشہ ہی دوسرا نظر آیا۔ بڑے ہنس مکھ، خوش جبیہہ، خوش شکیل، نرم مزاج، نرم رو، اور چہرے پر داڑھی تو خاص طور پر ملائم و خوشنما۔ بال ریشم کی طرح نرم اور چہرے پر خشونت و کرختگی کہیں نام کو نہیں۔ نماز عشا کا وقت آیا تو آواز بھی سُریلی اور مترنم، درد و گداز لئے ہوئے سُننے میں آئی۔ قرأت شاید سورۃ الملک کے دوسرے رکوع کے نصفِ آخر کی تھی۔ جوں ہی انھوں نے افمن یمشی مکبا علی وجہہ سے شروع کی معلوم ہوا کسی نے دل مَل دیا ہے۔ حالانکہ میں از سر نو اسلام لانے کے بعد بھی ابھی تک پختہ نہیں ہوا تھا۔ تعلقات یگانگت اسی وقت سے بڑھنے شروع ہو گئے، اور ان کی عمر بھر برابر بڑھتے ہی گئے۔ حج میں ساتھ رہا۔ ایک ایک منزل کی رفاقت مادی و روحانی ہر سطح کی رفاقت سے کئی درجے اور بڑھ گئی۔ مولانا دریاباد بھی آئے۔ لکھنؤ میں، اعظم گڑھ میں، حیدرآباد میں، پٹنہ اور خاص گیلانی (ضلع پٹنہ۔ موجودہ نالندہ) میں بارہا ملاقاتیں رہیں۔ اور آپس میں کسی قسم کا تکلف باقی نہ رہا۔ میری بیوی سے جو رشتہ عرفانی بہن کا انھوں نے لیا، اسے آخر وقت تک نباہ دیا۔ ہر خط میں ضروری ذکر ان عرفانی بہن کا کرتے۔ مولانا کی ذہانت، ذکاوت، حافظے کے کرشمے بار بار دیکھے۔ نعتیہ نظمیں خوب کہتے، اور خوب ترانداز سے پڑھتے۔ ہر مصرع کے ساتھ دلکشی اور جاذبیت بڑھتی ہی جاتی۔ بہار کی ہندی (مگدھی) زبان پر بھی قدرت انھیں حاصل تھی۔ اور ایسی قدرت

بے تکلف فارسی مصرعوں پر بلکہ عربی مصرعوں پر بھی!

تحریر میں جو بانکپن تھا، اُس سے کچھ ہی کم تقریر میں بھی تھا۔ موضوع کوئی سا بھی دیکھئے بس یہ معلوم ہوتا کہ خیالات کا دریا ہے کہ اُبلتا اور اُمنڈتا چلا آرہا ہے! کہاں کہاں سے مضمون پیدا کر لیتے! اور نکتہ سنجی اور دقیقہ آفرینی، قرآنی عنوانات میں اور زیادہ نمایاں ہوتی۔ اور قرآن کے بعد ہی نمبر حدیث کا رہتا۔ ایسی نکتہ سنجیوں کو اب کان ترس گئے ہیں۔

ماشاء اللہ کتابیں اچھی خاصی تعداد میں چھوڑ گئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، تدوین حدیث، تدوین قرآن۔ حیات قاسمی، مقالات احسانی، النبی الخاتم وغیرہ

انتقال گویا دفعتاً ہوا۔ وہیں گیلانی (ضلع مونگیر) اپنے وطن میں۔ سگے بھائی کا بیان ہے کہ بار بار دیکھنے میں آئی کہ عین انفکاک روح ہوتے ہی، داڑھی کے سفید بال ایک دم سیاہ ہو گئے اور چہرہ بالکل جوان آدمی کا معلوم ہونے لگا ——— میری جذباتی زندگی جن چند لوگوں سے خصوصاً وابستہ تھی ان میں ایک مولانا بھی تھے۔ عجب نہیں کہ اگر میرے نصیب میں جنت لکھی ہوئی ہے، تو مجھے لینے کے لیے مولانا خود آئیں!

ابوالکلام

(متوفی ۱۹۵۸ء)

مولانا ابوالکلام کے نام سے آشنائی اس وقت ہوئی جب ۱۹۰۵ء میں ان کے مضمون الندوہ میں چھپنے لگے۔ میں شاید نویں درجے کا طالب علم تھا، اور الندوہ اور اس کے ایڈیٹر مولانا شبلی سے بہت ہی متاثر و مرعوب تھا۔ الندوہ میں کسی کا ایک آدھ مضمون چھپ جانا ہی اس کے علم و فضل پر ایک زبردست دلیل تھی چہ جائیکہ کئی کئی مضمونوں کا! ابوالکلام یقیناً کوئی مولانا شبلی ہی کے ٹکر کے "مولانا" ہوں گے اور اپنے کلے ٹھلے سے "مولانا" معلوم بھی ہو رہے ہوں گے۔ ان کے مضمونوں کی قدرت انشائی اور بلند آہنگی تو یہی کہے دیتی تھی ـــــ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کا جلسہ دستار بندی رفاہ عام کی عمارت میں ہوا، میں سیتاپور سے آکر شریک ہوا۔ مولوی سید سلیمان ندوی کا آخری سال تھا۔ انھوں نے اپنی برجستہ و امتحانی عربی تقریر میں کہیں یہ کہہ دیا کہ اسلام کی لازمی شرط تو کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا پڑھ دینا ہے۔ مولانا شبلی نے ٹوکا کہ ہاں پورا کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ معاً حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو داڑھی والے اور "مشین" تھے خود مولانا شبلی کو ٹوکا کہ آپ گڑبڑاتے ہیں، لڑکا ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ حدیث میں آچکا ہے من قال لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ دل نے کہا کہ یہ صاحب یقیناً مولانا ابوالکلام ہی ہوں گے، ان کے سوا اور کس میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ مولانا شبلی کو ٹوک دے۔ خیال تمام تر غلط نکلا۔ ابوالکلام اس وقت تک اس سن سال کے بھی نہ تھے، اور چہرہ بالکل صاف رکھتے تھے، داڑھی اول تو تھی ہی کہاں اور بہرحال جتنی تھی بھی، اُسے رکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا ـــ حکایت سے اندازہ صرف اس کا کیجئے کہ شبلی کی طرح ابوالکلام کا بھی رعب دل پر کتنا

بیٹھا ہوا تھا۔

سن ۱۹۰۹ء تھا کہ میں کیننگ کالج کا طالب علم تھا کہ ایک دن، دن کے وقت لکھنؤ اسٹیشن کسی کو رخصت کرنے گیا۔ دیکھا کہ ایک نوجوان، وجیہہ، شکیل، داڑھی مونچھ صاف، سکنڈ کلاس (آج کے فرسٹ کلاس) ویٹنگ روم سے باہر نکلا، غالباً سگریٹ منھ میں دبا ہوا۔ کالا ترکی کوٹ اس کے گورے رنگ پر بڑا ہی بھلا لگتا تھا۔ اور کسی نے بتایا کہ ابوالکلام یہی ہیں۔ یقین نہ آیا، مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مدت کے بعد ملاقات مولانا شبلی کے مکان واقع گولہ گنج میں ہوئی، ان کے ہاں آئے ہوئے تھے، اور میری حاضری اکثر مولانا شبلی کے ہاں ہونے لگی تھی۔ مولانا اس وقت گولہ گنج احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی میں رہتے تھے۔ دارالعلوم سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر۔ مولانا نے تعارف کرایا بے تکلفی سے انھیں صرف آزاد، کہہ کر پکارتے تھے، اور تعارف باقاعدہ ہو گیا۔ دارالعلوم ندوہ کچھ دن بعد اپنی نئی اور مستقل عمارت میں گومتی پار اٹھ گیا۔ مولانا منتقل ہو کر نئے امین آباد پارک کے ایک پرفضا بالاخانہ غالباً ۱۵ء پر آگئے۔ اور اب جب ابوالکلام کا لکھنؤ آنا ہوتا تو یہیں ٹھہرتے۔

اب مراسلت بھی اُن سے شروع ہو گئی تھی، اور بظاہر اچھے خوشگوار تعلقات تھے لیکن اندرونی حالات، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور دوسرے ندویوں سے جو معلوم ہوتے رہتے تھے، اور جہاں ان کی ذہانت طباعی، حاضر دماغی اور قوت حافظہ کی مدح و داد میں ہوتے تھے، وہیں ان کی دینی و اخلاقی حالت کی طرف سے کچھ اطمینان بخش نہ تھے اور غضب یہ تھا کہ خود مولانا شبلی بھی ان روایتوں کی کھُل کر تردید نہیں کرتے تھے۔ راوی یوں بھی فی الجملہ ثقہ و معتبر ہی تھے، اب گویا مُہر تصدیق لگ گئی —— اور اب دل میں وقعت عظمت پیدا ہونے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

اپریل سنہ ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا مصری لکھنؤ ندوے میں بحیثیت صدر مجلس کے آئے۔

ظاہر ہے کہ اُن کا برجستہ خطبہ عربی میں تھا۔ مولانا ابوالکلام بھی سامعین میں تھے۔ اصل تقریر کے معاً بعد انھوں نے اس کا ترجمہ ایسا رواں اور فرفر کر دیا کہ اوروں کے ساتھ مولانا شبلی کو بھی حیرت ہو گئی۔ جون ۱۹۱۳ء میں محض سیاحتہً کلکتے جانا ہوا۔ الہلال نکل رہا تھا۔ اور خوب زوروں پر۔ مولانا نے بہ اصرار اپنے ہاں اُتارا، اور بڑے اخلاص سے مہمان نوازی کرتے رہے، مولانا سلیمان ندوی، اور مولانا عبداللہ عمادی اور دو ایک اور بزرگ الہلال کے اسٹاف میں تھے، ان سب کی ملاقات و حُسنِ التفات نے قیام کلکتہ کو لطف و انبساط سے بھر دیا۔ مگر ساری گفتگوئیں، ادبی علمی پہلوؤں سے رہتی تھیں۔ مذہب کا چرچا نہ دیکھا، نہ سُنا، اور مجھ اُس وقت کے ملحد کو فضا اس سے بہتر اور کیا ملتی ـــــ کچھ ہی روز بعد الہلال میں میری ایک نئی کتاب فلسفۂ جذبات کے سلسلے میں ایک علمی اصطلاح سے متعلق الہلال کے ایک اختلافی نوٹ سے ایک ادبی بحث چھڑ گئی۔ اور بالکل بلا وجہ اس میں تلخی پیدا ہو گئی۔ ملال دل میں پہلے سے موجود ہی تھا۔ اس گرما گرمی نے اُسے تیز سے تیز تر کر دیا۔ اور ایک مخلص (مولانا عبدالباری ندوی) نے اگر مجھے خاموش ہو جانے پر مجبور نہ کر دیا ہوتا، تو خدا معلوم نوبت کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ـــــ اللہ مجھے اور فریق مقابل دونوں کو اس کے لئے معاف فرمائے۔ زیادتی اب سوچتا ہوں اور سالہا سال ہوئے کہ سوچ چکا ہوں، میری ہی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں جب میں حیدرآباد میں تھا، اور مولانا رانچی جیل میں، تو اس رنجش کی صفائی بھی مراسلت سے میں نے کر لی۔ اور مولانا نے بہ درجہ اخلاق کریمانہ یہ لکھ دیا کہ کوئی کدورت یا رنجش میری طرف سے تو کبھی ہی نہیں۔ اور اس کے بعد آخر تک تعلقات معتدل و متوازن رہے۔ خلافت کمیٹی کے سلسلے میں ملاقاتیں کثرت سے رہیں، پہلے کانپور اور پھر بار بار دہلی میں۔

اور لکھنؤ جب جب مولانا لیڈر ہونے کے بعد آئے اور اب مولانا شبلی کی وفات کے بعد لکھنؤ کے ایک بڑے ہوٹل (اس وقت تک سول اینڈ ملٹری۔ اور اب برلنگٹن) میں ٹھہرتے تھے۔ تو غریب خانے پر آکر بھی عزت افزائی فرماتے۔

مولانا کا مسلسل قیام لکھنؤ میں کل چھ مہینے کا رہا (۱۹۰۵ء میں) مگر اتنے دنوں کے قیام میں لکھنوی زبان کے اُن گوشوں پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا، جو صرف سالہا سال کے قیام ہی سے حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک باریک چیز پہلوئے ذم سے احتیاط ہے۔ اچھے اچھے اس میں غچہ کھا جاتے ہیں۔ مولانا نے اسے گرفت میں لے لیا تھا، اور لکھنؤ کے بعض استاد تک ان کے سامنے زبان کھولتے ہچکچاتے تھے۔ مرزا عزیز لکھنوی اہل زبان تھے۔ ان کا دیوان "گلکدہ" جب چھپا، تو مولانا نے اپنے تبصرے میں زبان کی بھی گرفتیں دو ایک کیں۔

مولانا نے علوم عربی اسلامی کی تحصیل و تکمیل باقاعدہ کی ہو یا نہ کی ہو، بہر حال ان کی نظر کہنا چاہیے کہ سارے ہی علوم دینی پر وسیع و محیط تھی، اور دماغ مجتہدانہ لے کر آئے تھے۔ آخر عمر میں اخلاقی حیثیت سے بڑے پاکیزہ ہو گئے تھے اور عمر میں پختگی اور سنجیدگی آجانے سے شوخی و ظرافت پر قابو حاصل ہو گیا تھا۔ دوسرے کا کام نکال دینے میں ہر وقت مستعد و آمادہ رہتے تھے۔ بڑی بات یہ کہ ہندی سرکار، اور ہندو اہل حکومت سے اتنا گہرا اور ہمہ وقتی تعلق رکھنے کے باوجود وہ اکثریت سے مرعوب ذرا نہیں ہوئے۔ اور کسی موقع پر بھی اپنے کو مسلمان کہتے نہ شرمائے —— لغزشیں اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ اللہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

جواہر لال تو ان کی سوجھ بوجھ اور عقل سیاسی کے بھی بہت قائل تھے۔

حسن تقریر میں بے مثل تھے، پہلے تقریر اور زیادہ جوشیلی ہوتی تھی، اور بعض لفظ اور فقرے ناملائم بھی زبان سے نکل جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس پر انھوں نے قابو حاصل کر لیا، اور تقریر بڑی صاف شستہ، پرمغز، مدلل و مصالحانہ ہونے لگی تھی۔ اردو زبان کے وہ ادیب ہی نہیں، ایک صاحب طرز انشاپرداز تھے، اور جو رنگ انشا اُن کا تھا۔ اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہ ہو سکا۔ بڑا ہی ظلم ان لوگوں نے کیا ہے جنھوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخیں لکھی ہیں اور مولانا کو برابر نظر انداز کیا ہے۔ یہ ظلم مولانا اور اردو زبان پر تو ہی ہے، خود اپنے اوپر بھی ظلم ان کے لکھنے والوں نے کیا ہے۔ پہلے تحریریں عربیت آمیز اور ثقیل ہوتی تھیں۔ آخر کی

تحریریں بڑی سلیس اور عام فہم اردو میں ہونے لگی تھیں ــــــــ جب مولانا کی یاد آتی ہے بہت ہی خوشگوار یادوں کا جھرمٹ اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ حشر میں ان کے اور مولانا سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی کے درمیان مخالفتوں کو دور کردے۔

ونزعنا ما فی صدورھم من غلٍ ۔

ظفر حسین خاں

(متوفی ۔ ۱۹۵۹ء)

۱۹۰۹ء میں، جب کیننگ کالج لکھنؤ میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں آیا، تو کالج کے یونین میں دیکھا کہ ایک خوش رو نوجوان مسلمان لڑکا بھی شامل ہے، انگریزی بحث و مباحثے میں خاصا حصہ لینے والا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ پہلے سال کا طالب علم ہے، ابھی داخل ہوا ہے، نام ظفر حسین خاں ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ قومی حیثیت سے میں پورا مسلمان اس وقت بھی تھا، باوجود دینی حیثیت سے "لاادری" ہو جانے کے ہر مسلمان کی خوشی سے خوش ہوتا، جس سے مسلمانوں کی نیک نامی ہوتی۔ طلبہ کے یونین یا ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں بولنے والوں کی اکثریت کیا معنی، بڑی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ وہی ہر بحث و مباحثے میں چھائے ہوئے رہتے تھے۔ یونین کی زبان انگریزی تھی اور صدر انگریزی کے پروفیسر مسٹر کیمرن تھے۔ مسلمان بولنے والے صرف دو تھے، ایک پٹنہ کے سید باقر حسین (علیگ) جو کچھ ہی سال کے بعد بیچارے مرحوم ہو گئے۔ دوسرے سید کلب عباس، جو ماشاءاللہ اس وقت بھی شیعہ لیڈر کی حیثیت سے زندہ و سلامت ہیں، اور تیسرے اب یہ شامل ہوئے۔ اور پہلے دونوں کی طرح یہ بھی اتفاق سے امامیہ مذہب کے تھے ——— طالب علمی کے اُس دور میں شیعہ سنی سے کیا بحث تھی، بس اتنا بالکل کافی تھا کہ آدمی قومی و مجلسی حیثیت سے مسلمان ہو۔

تعلقات قائم ہوئے، پینگ بڑھے، اور صاحبزادے میرے مزاج کو ہر طرح قابل قبول ثابت ہوئے۔ مکان تو مراد آباد تھا، لیکن لکھنؤ میں قرابتیں اچھی خاصی تھیں۔ شیخ زادوں میں اور ہماری برادری سے جا کر ڈانڈے مل گئے تھے۔ بڑے ذہین، نستعلیق، شائستہ و مہذب تھے۔ خوش تحریر بھی، خوش تقریر بھی، وسیع المطالعہ تھے، خاص کر انگریزی ادبیات کے باب میں۔ میں نے MEREDITH کا نام سب

پہلا انھیں کی زبان سے سُنا۔ مضمون نگاری خاصی کرلیتے۔ کالج زمانے میں میرے مخصوص مخلص دوست دو ہی چار تھے، انھیں میں ایک یہ بھی تھے۔

پورا نام صاحبزادہ ظفر حسین خاں بی۔ اے تھا۔ ٹریننگ پانے کے بعد کسی اسکول میں ٹیچر ہو گئے شاید امروہہ میں تھے۔ میں ایک بار دہلی گیا تھا۔ یہ اس وقت امروہہ میں تھے، واپسی میں اسٹیشن پڑا اور انھوں نے مجھے زبردستی اُتار لیا۔ اور خوب خاطریں کیں۔

اپنے کام میں بڑے ہوشیار و مستعد تھے، پہلے ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات ہوئے، پھر اسسٹنٹ انسپکٹر ہو گئے اور "خاں صاحب" خطاب پایا۔ اخیر میں انسپکٹر کے عہدے اور "خاں بہادر" ہو کر پنشن لی۔ انسپکٹر آف اسکولز کا عہدہ اس وقت خاصا بڑا ہوتا تھا۔

پنشن کے بعد، شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہو گئے اور شاید دو برس تک رہے۔ اردو میں ایک ناول لکھا۔ سعیدہ کے خطوط۔ شاید کچھ آپ بیتی ہے۔

تعلقات کا بڑا خیال رکھتے۔ انگریزی میں فلسفے کا مطالعہ بھی وسیع تھا، آخر میں شاید دو کتابیں لکھیں، ایک انواع فلسفہ، دوسری مآل دہشیت۔ اس دوسری کتاب پر مولانا ابوالکلام (وزیر تعلیمات ہند) نے پانچ ہزار کا انعام دلوایا۔ (اس وقت پانچ ہزار آج کے ۲۵ ہزار سے کم نہ تھے)۔— مولانا کے ہفتہ وار الہلال میں کسی زمانے میں مقالہ نگاری کر چکے تھے۔

بڑے شریف تھے۔ اپنے ان کے طویل تعلق میں تو میں نے کبھی انھیں غصہ آتے نہیں دیکھا۔ کبھی بھی رنجش نہ ہوئی۔ مسلمانوں کی مدد کو ہر وقت تیار رہتے۔ میرے طویل ملحدانہ دَور کے باوجود خود سیدھے سادے مسلمان اول سے آخر تک بنے رہے۔ ادبی سوسائٹی میں جب کبھی اظہار خیال کا موقع مل جاتا تو اسلام کی حمایت، وحقانیت میں تقریر کرنے کا موقع نکال کر رہتے —— اتنے بے تعصب اور روادار شیعہ اگر اور بھی ہو جائیں تو شیعہ سنی نزاع کا وجود ہی نہ باقی رہ جائے۔

میں ایک بار لکھنؤ میں اُن کے ہاں ان کے شیعہ کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں دریاباد سے ملنے گیا، اتفاق سے وہ عین عاشورہ محرم کی تاریخ تھی، اچھی طرح اور معمول کے مطابق ملے، لیکن ہنس کر یہ

بھی فرمایا کہ " دیکھئے کسی اور شیعہ کے ہاں دسویں محرم کو نہ چلے جائیے گا۔

لکھنؤ میں بڑی طویل اور تکلیف دہ بیماری کے بعد وفات پائی۔ وہیں حسرت زدہ دل کے ساتھ قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا۔

بہادر یار جنگ

(متوفی سنہ ۱۹۴۴ء)

بہادر یار جنگ کو پہلی بار اس وقت جانا جب وہ ابھی عثمانیہ کالج کے طالب علم ہی تھے، اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے ایک شاگرد، اور چہرے پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی اس وقت بھی تھی، جاگیردار تھے۔ اور امیرزادے۔ لیکن تسخیر خلقت اس نوجوانی میں بھی۔ ہونہار مقرر و خطیب کی شہرت اس وقت بھی رکھتے تھے۔ بعد کو ملک کے ایک بہترین خطیب و مقرر ثابت ہوئے۔

ان کے تقریری کارنامے زبانوں پر آنے لگے اور اخباروں میں چھپنے لگے ہیں ان کا گرویدہ سے گرویدہ تر ہوتا گیا۔ نام مسلم لیگ کا ہوتا تھا، لیکن ان کا پیام وہی ہوتا، جو اکبر و اقبال کا تھا یعنی اسلامیت کی تجدید کا۔ اور عالم اسلام کی مواخات۔ کا۔ مسلم لیگ کے سارے لیڈروں میں میرے معیار پر پورے اترنے والے وہی ایک تھے۔ مالک بے نیاز کی مشیت میں کون دخل دے سکتا ہے۔ عین جوانی میں بے شان گمان چشم زدن میں انھیں واپس بلالیا۔

حافظ کے مصرعہ میں ہے ؎

کہ خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

تو دولت مستعجل" کا مصداق ان سے بڑھ کر اور کون ہوگا! زندہ رہ جاتے تو لیگ، اور پاکستان دونوں اس بری حالت کو نہ پہنچتے۔ بہترین قائد خود ہونے کے باوجود پارٹی ڈسپلن کے سخت پابند تھے اور اپنے کو جناح صاحب کے مقابلے میں ہیچ ہی سمجھتے

کہا جاتا ہے کہ فرقہ مہدوی کے تھے۔ لیکن میں نے عملی حیثیت سے کوئی ان سے بہتر

مسلمان کم ہی دیکھا ہے۔ نماز کیا معنی، نوافل، تلاوت وغیرہ کے شدید پابند تھے۔ اور تقریر جو کرتے مُدلل و مفصل ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہوتی ــــــــــــ محمد علی کے بعد ایسا جامع کمالات بھی ایک لیڈر مسلمان ہی میں پیدا ہوا تھا، جو اگرچہ انگریزی خطابت کا مرد میدان نہ تھا لیکن زبان پر قابو رکھنے اور غصّے کو پی جانے میں اُن سے بڑھا ہوا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی قسمت ایسی کہاں تھی، عین جوانی میں اور جبکہ صحت کہیں سے بھی خراب نہیں معلوم ہو رہی تھی بالکل دفعتًا اور چشم زدن میں یہ نعمت مسلمانوں سے چھن گئی۔ ۱۹۴۳ء ہی میں۔ یہ ایک رہنمائے قوم و ملّت اگر زندہ رہ جاتا تو اول تو پاکستان کے اس طرح کے بننے کی نوبت ہی کیوں آتی اور اگر آتی بھی تو وہ پاکستان جناح صاحب کے بنائے ہوئے پاکستان سے کس درجہ مختلف ہوتا! اور نہ حیدرآباد ہی کا وہ حشر ہوتا جو قاسم رضوی صاحب کی قیادت و سیادت میں ہوا!۔

نیاز فتحپوری

(متوفی ۱۹۶۶ء)

دیکھنے میں اچھے خاصے بھلے آدمی۔ ملنے ملانے میں مرد معقول۔ بات چیت، برتاؤ، رکھ رکھاؤ میں مُہذب و شائستہ، مُراسلت کا اتفاق ہو، تو جواب شریفانہ پایئے۔ ایک مرتبہ دو ڈھائی دن کے ایک طویل سفر میں ریل میں ساتھ ہوا، نمازیں میرے سامنے پڑھیں۔ صبح سویرے مرزا مظہر جان جاناں کا صوفیانہ و عارفانہ کلام ترنم کے ساتھ سنایا کیے۔ ذاتی زندگی سنتا ہوں کہ متوسط الحال شریف مسلمانوں کی سی ہے۔ غریبوں محتاجوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے ہیں۔

لیکن نگار فتنۂ روزگار! نگار کے اوراق میں انھیں دیکھیے تو یہ دوسرے ہیں۔ لحاظ نہ اپنے عہد و پیمان کا نہ دوسروں کے دین و ایمان کا! ہر ناجائز اس کے صفحات میں جائز، اور ہر ناگفتنی اس بزم کاغذی میں گفتنی! حق تعالیٰ کی ذات سے لے کر قرآن مجید و انبیائے کرام، ملائکۂ مُقربین سب کے ساتھ تمسخر و استہزا، گستاخیاں اور بدتمیزیاں!

۱۹۳۱ء میں "سچ" نے زبردست لے دے شروع کی، اور قوم نے سخت پکڑا، تو ڈھیلے پڑ گئے، اور لگے بار بار توبہ نامہ شائع کرنے۔ آئندہ کے لیے وعدے کیے۔ کان پکڑے۔ ۱۹۴۰ء میں موقع پا، میدان خالی دیکھ، پھر الحاد نے زور باندھا۔ اب کی تبلیغ یہ شروع ہوئی، کہ قرآن مجید کلام الٰہی نہیں، کلام بشری ہے! ۱۹۴۵ء میں ایک مرے کھپے دشمن اسلام پادری کی آڑ پکڑ ایک بار پھر قرآن مجید پر زہر افشانی شروع ہو گئی! ——— غرض فتنہ فروشی کا ہر روز ایک نیا سوانگ، اور نگار کی گرم بازاری کے لیے روز ایک نیا عنوان!

کاش نیازؔ اپنے نفس امّارہ نگارؔ کے بغیر محض نیاز ہی ہوتے! عالم، فاضل محقق نہ سہی "مرزا اشرف صاحب ایمان" ہونا کیا تھوڑی بات ہے؟ — پہلے لوگ باطن میں کافر اور ظاہر میں مومن ہوتے تھے اور ان کے لئے اصطلاح "منافق" کی تھی، اب یہ ایک نیا فتنہ ہے کہ چاہے باطن میں مومن ہی ہوں، لیکن ظاہر اپنے کو کافر کریں گے — اور صاحب نگارؔ شاید اسی مرض کے شکار ہیں۔

لیکن اب عین جس وقت یہ سطور حوالۂ قلم ہو رہی ہیں نگارؔ میں بھی آثار رشد و اصلاح کے معلوم تو ہو رہے ہیں۔ اللہ انھیں قیام و ثبات دے — نگار کے پرچے نیازؔ صاحب کی زندگی کے آخر تک دیکھ لیے اللہ کرے کہ دین کی راہ دل سے اختیار کی ہو۔

؎۱۹۵۶ء میں نیاز صاحب نے مع نگار ہندوستان چھوڑ کر پاکستان (کراچی) جا بسایا تھا۔

مولوی صبغت اللہ شہید فرنگی محلی

(متوفی ۱۹۶۴ء)

ان سے کوئی قرابت نہ تھی، لیکن محبت و یگانگت کے تعلقات کسی عزیز قریب سے کم بھی نہ تھے۔ میرے ہم سن ہی ہوں گے یا پھر ایک دو سال چھوٹے۔ فرنگی محلیوں سے ہم لوگوں کے تعلقات یوں بھی عزیزانہ تھے، اور پشتوں سے چلے آتے ہیں، انھوں نے اپنی ذات سے اور زیادہ بڑھا لیے۔

مدرسۂ نظامیہ کے پڑھے ہوئے باقاعدہ عالم تھے، اور بیعت طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے تھی۔ علم سے تو اپنے کام نہ لیا، البتہ خطابت و طلاقت لسانی کو خوب کام میں لائے تقریر کی خوب مشق کر لی تھی، اور تقریر مذہبی اور سیاسی موضوعات پر بڑی جوش کی اور بہترین رنگ کی کر لیا کرتے تھے۔ خصوصاً میلاد نبوی کی محفلوں میں اور محرم کی مجلسوں میں دور دور سے بلائے جاتے تھے۔ اور بمبئی کے سیٹھوں نے ان کی خدمت اس نام سے اپنے اوپر لازم کر لی تھی۔ عقائد میں بدعات کی طرف بہت دور چلے گئے تھے۔ آخر عمر میں انھیں احساس ہو گیا تھا اور انھوں نے اصلاح کی طرف توجہ کر لی تھی۔ اور اب حضرت تھانوی کی کتابیں بجائے طعن و اعتراض کے عقیدت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ انتہائی شوخ مزاج اور زندہ دل تھے۔ ابھی اس پر کوئی آوازہ کس دیا، ابھی اُس پر کوئی پھبتی کہہ ڈالی، مراعات النظیر، یا ضلع جگت کی عادت میری ہی صحبت میں پڑی۔ اور پھر اتنی بڑھی کہ مجھے بار بار روکنا پڑتا تھا۔ حدود کا کوئی لحاظ ہی نہیں رہ گیا تھا۔

شاعر بھی تھے اور آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ دوسرے شاعروں سے بھی نوک جھونک

رہتی تھی۔ ان کے ماموں اور خُسر مولوی عظمت اللہ صاحب (شارح نفحۃ الیمن) اور میرے شفیق اور صاحب علم استاد سیتاپور ہائی اسکول میں رہ چکے تھے۔ عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی اور ترجمہ و تفسیر قرآن میں کام آئی وہ انھیں کے طفیل میں آئی۔ شہید صاحب کی بیوی انھیں کی صاحبزادی اور میری اُستاد زادی۔ اس رشتے سے میں اُنھیں اپنی بہن ہی سمجھتا رہا۔ بچاری اپنے شوہر سے کئی سال پہلے دنیا سے کوچ کر گئیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد ہاشم انصاری نے خوش تقریری باپ سے ورثہ میں پائی۔ ماشاء اللہ خوب بول لیتے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے حبیب میاں سلمہٗ مدت ہوئی پاکستان ہجرت کر گئے۔ اور مالی حیثیت سے بڑے فارغ البال ہیں۔

شہید صاحب انھیں سے ملنے ڈھاکہ جا رہے تھے کہ کلکتے میں پیام اجل آگیا۔ نعش برف میں دبا کر لکھنؤ لائی گئی۔

مجھ سے بڑی ہی محبت کرنے والے تھے۔ اور اس میں حد سے تجاوز کر جانے والے۔ ایسی محبت کرنے والے نصیب ہی سے نصیب ہوتے ہیں۔

میر نیرنگ

(متوفی ۱۹۵۲ء)

نام غلام بھیک تھا، تخلص نیرنگ۔ نام کے بجائے شہرت اسی تخلص کو حاصل رہی، اپنے وطن انبالہ میں سرکاری وکیل تھے۔ اچھی طرح جرح کرنے والے تھے۔ شاعری پر دینداری غالب رہی، شروع میں اقبال کے ساتھیوں میں رہے۔

۱۹۲۶ء میں ندوے کا جلسہ انھوں نے انبالہ میں دھوم دھام سے کرایا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور خوش بیان حضرات خوب خوب بولے اور سب سے بڑھ کر نمبر عطاء اللہ شاہ بخاری کا رہا۔ بے تکان چار چار گھنٹے بولتے، اور مسلمانوں کا مجمع اس قوت "تقاری" ہی کا تو مارا ہوا ہے۔ کچھ اور ہو یا نہ ہو، بس اچھی تقریریں ضرور ہوں، اور اگر یہ ہوگیا تو جلسہ ہر طرح کامیاب رہا۔

تحریک خلافت کے زوال و انحطاط کے بعد ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے تنظیم کے نام سے ایک آل انڈیا تحریک چلائی، اس برات کے دولھا کہنا چاہیے کہ نیرنگ صاحب ہی تھے، ملک بھر میں دورہ کیا اور پھر آریہ سماجیوں کی مذہبی تحریک "شدھی" کے جواب میں انھوں نے "تبلیغ" کا بھی حق ادا کر دیا۔ (حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی جماعت تبلیغی اس کے بہت بعد بنی۔ نیرنگ صاحب کی جمعیت تبلیغ اس کے علاوہ اور اس سے پیشتر تھی)

۱۹۲۹ء میں جب میں حج کو حاضر ہوا، تو ان سے مدینہ منورہ میں خوب پُرلطف صحبتیں رہیں۔ اور کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ واپسی میں جہاز پر بھی ساتھ رہا۔

بہرحال بڑے پرخلوص بزرگ تھے، مسلمانوں کے ہر کام میں پیش پیش، ابھی اس

کام میں آگئے۔ ابھی اس کام میں، تحریر کا کام اچھا خاصا انگریزی میں کیا کرتے تھے۔ آج یہ رپورٹ تیار کی اور کل وہ۔ اور شخصیت بھی بڑی دلآویز رکھتے تھے۔ لوگوں نے انھیں شیخ التبلیغ کہنا شروع کردیا تھا، اور یہ ایسا بے جا نہ تھا، جب یاد آتے ہیں، تو دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن

(متوفی - ۱۹۴۹ء)

پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ میں لکھنؤ کیننگ کالج میں بی، اے کا طالب علم تھا اور فلسفہ لیے ہوئے تھا۔ خیالات کے لحاظ سے مُلحد یا لا ادری۔ یہ اس وقت علی گڑھ میں فلسفے میں ایم، اے کر چکے تھے اور شاید اس کے ریسرچ فیلو تھے۔ میں ضلع علی گڑھ میں اپنی ہمشیر کو ان کے شوہر (ڈاکٹر حاجی محمد سلیم) کے پاس پہنچانے گیا تھا۔ وہاں سے کالج دیکھنے علی گڑھ آیا اور ان سے ملنے کا فخر حاصل کیا۔ اس وقت ان کی بڑی ہی قدر میرے دل میں تھی کہ یہ فلسفے کے ماہر اور اس میں ایم، اے تھے۔ سندیلے کے عبدالستار صدیقی (جو بعد کو جرمنی جا کر پی، ایچ ڈی ہوئے) اس وقت علی گڑھ سے ایم، اے کر کے وہیں مقیم تھے۔ پنی ہوسٹل (کچی بارک) میں انھیں کے ہاں اُترا تھا۔

سیّد صاحب خشک بالکل نہ تھے (جیسا کہ میں ڈر رہا تھا) بڑی محبت سے پیش آئے۔ کھانے پر مجھے بلایا اور خوب مزے دار کھانا کھلایا۔ گفتگو زیادہ تر فلسفہ اور نفسیات ہی کے مسائل پر رہی۔ سید صاحب اس وقت بھی پورے مسلمان تھے اور پورے مذہبی۔ پھر یہ فلسفے میں ڈگری لینے جرمنی گئے۔ اور جنگ (یعنی یورپ کی پہلی جنگ عظیم) چھڑ جانے سے کئی برس ان کو رہ جانا پڑا۔ علمی ترقیوں کے ساتھ مذہب اور دینداری میں بھی ترقی کرتے رہے۔ واپس آکر اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لا کر، علی گڑھ ہی میں فلسفے کے اُستاد ہو گئے۔ اخیر ۱۹۱۲ء میں خود ایم، اے کرنے علی گڑھ گیا، یہ اس وقت تک یورپ نہیں گئے تھے، سہ پہر کو اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لالچ اس کا بھی ہوتا کہ چائے پینے کو ملے گی تازہ، گرما گرم گلاب جامنوں کے ساتھ۔

رہنے والے غالباً انبالہ کے تھے اور انبالہ کے مشہور ایڈوکیٹ نیرنگ صاحب کی صاحبزادی ان کے عقد میں تھیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد جب میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر کی حیثیت سے علی گڑھ جانے لگا۔ تو ان سے مل کر بڑا جی خوش ہوتا۔ مومن دیندار بلکہ مجاہد بن گئے تھے۔ چہرے پر لمبی داڑھی اتنی بڑھالی تھی کہ فلسفی اور فاضل مغربیات ہونے کے بجائے کوئی ملّائے مسجد معلوم ہوئے۔ اپنے لڑکے کو اقبال کے ملّی ترانے یاد کرادیے تھے انھیں وہ خوب کڑک کر سنایا کرتا۔ ان کے شاگرد آزاد خیال تو کیا ہوتے۔ دین و ملت کی خدمت کے جوش سے سرشار نکلتے، اپنے فلسفے کے درس میں اسلامیت کا درس بھی شامل رکھتے۔ افسوس کہ طبیعت لکھنے پر کچھ زیادہ آمادہ نہ تھی۔ چنانچہ کوئی بڑی تحریری یادگار نہ چھوڑی۔ ایک رسالہ البتہ چھوڑ گئے ہیں۔ بنی اور نبوت، ایسا ہی کچھ نام ہے۔

تمام تر مغربی علوم پڑھ کر بھی مغربیت سے غیر متاثر رہے۔ شیطان کے ناکام رہنے کی ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے میں آئی ہیں۔ پاکستان بنتے ہی اُدھر ہجرت کر گئے تھے۔ اور جلد ہی رحلت بھی فرما گئے۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی

(متوفی ۱۹۵۳ء)

علامہ شبلی کے جانشین اگر علامہ کی حیثیت سے کوئی ہو سکتے تھے تو وہ علامہ سلیمان ندوی ہی ہو سکتے تھے۔ کیا وسعت نظر تھی، اور کیا نظر میں گہرائی تھی! میں عقیدت مند آدھا تو اسی وقت ہو گیا تھا، جب خود اسکول کے نویں درجہ کا طالب علم تھا۔ اور ان کی بھی طالب علمی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ الندوہ ۱۹۰۶ء میں ان کے مقالے جاذب نظر ہونے میں۔ شبلی کے بعد ہی درجہ رکھتے تھے۔ مطالعہ کا انھیں شوق ہی نہیں، مطالعہ سے انھیں عشق تھا۔ اور ان کے ذہنی شغف و انہماک کا حال تو ان سے ملنے ملانے کے بعد ۱۹۰۸ء سے معلوم ہونے لگا!

مجھ سے تعلقات مخلصانہ کیا معنی، عزیزانہ رکھتے تھے، اور ۴۵ سال کی مدت میں تعلقات اور گہرے ہی ہوتے گئے۔ سید صاحب فراغ تعلیم کے بعد عرصے تک لکھنؤ ہی میں رہے، ندوے میں بہ حیثیت مدرس کے اور میں کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ خیالات و نظریات میں دینی اختلاف تو کھلا ہوا تھا، اور سیاسی بھی وقتاً فوقتاً ہو جایا کرتا۔ ۱۹۰۸ء سے تین چار برس کا زمانہ کافی مدت کا ہوا۔ طالب علمانہ شوخی اور چھیڑ چھاڑ مجھ میں بھی تھی، ان میں بھی بحثیں کھل کر ہوتیں لیکن کبھی بھی تلخی نہ آنے پاتی۔ سید صاحب ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں کلکتے چلے گئے۔ الہلال میں۔ میں وہاں جون ۱۹۱۳ء میں سیاحت پر گیا تو صاحب الہلال کے یہاں انھیں کے اصرار پر ٹھہرا اور اس طرح سید صاحب سے بھی خوب جم کر ملاقات رہی۔ سیر سپاٹا بھی ساتھ رہا۔ اس کے بعد وہ جم کر تو لکھنؤ نہیں رہے، لیکن آمد و رفت بہ کثرت رہتی اور بعض دفعہ ہفتوں کے ہفتے وہ لکھنؤ میں ٹھہر جاتے۔ خط و کتابت میں بھی کوئی لمبا ناغہ نہ ہونے پاتا۔

دار المصنفین کے قیام نے ہم دونوں کو قریب سے قریب تر کر دیا۔ مولانا عبدالباری ندوی کبھی مزاحاً اور کبھی سنجیدگی سے مجھ سے کہا کرتے کہ "جانشین شبلی یہ سید صاحب کیسے ہو گئے۔ جانشینی کا حق تو تمہیں پہنچتا تھا" سید صاحب خود ناظم تھے اور مجھے کبھی نائب صدر بنا کر رکھتے اور کبھی کچھ اور۔ مسلم یونیورسٹی میں کورٹ کے بھی ہم دونوں ممبر تھے۔ اور ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) کے بھی ہم دونوں ——— میری شادی (جون ۱۹۱۶ء) میں شروع سے آخر تک شریک رہے۔ ولیمے میں شرکت کے لیے دریاآباد آئے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں سید صاحب کی اہلیہ ثانی دِق میں مبتلا ہوئیں، اور سید صاحب انھیں لیے ہوئے مدتوں لکھنؤ رہے۔ اور کرائے کا مکان لے کر مجھ سے قریب ہی ٹھہرے۔ میرا قیام اس وقت لکھنؤ میں تھا اور پھر جب سے (سنہ ۱۹۲۱ء سے) میرا قیام دریاباد ہو گیا ادھر سے گزرتے ہوئے سید صاحب ایک سے زائد بار یہاں اُترے۔ ایک بار ایسے ہی سفر میں ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ کو بھی اپنے ساتھ لائے۔ (یہ وہی ذاکر صاحب ہیں، جو آخر میں مملکت ہند کی صدارت پر فائز رہے) کئی سال کے دورِ الحاد و تشکیک کے بعد جب سنہ ۱۹۲۰ء میں میں نئے سرے سے مسلمان ہوا ہوں تو بہت خوش ہونے والوں میں ایک سید صاحب بھی تھے۔ معارف کی ادارت میں بھی ایک مدت تک مجھے ان کی رفاقت و ماتحتی کا شرف حاصل رہا ——— اختلافات بار بار پیش آتے رہے لیکن بدمزگی شاید ایک بار بھی نہیں ہوئی یہ خوش قسمتی سید صاحب کے دوسرے رفیقوں کے نصیب میں نہ آئی۔

تصوف کی طرف لانے اور حضرت تھانویؒ کی بزم تک پہنچانے والا میں نہ تھا۔ اس کا سہرا مولانا عبدالباری ندوی کے سر بندھنا چاہیے تھا۔ لیکن اس راہ میں اپنی بساط کے لائق معین و معاون یہ خاکسار بھی رہا کیا۔ سید صاحب جب مراتب و مدارج صوفیت میں قدم بڑھانے لگے تو ایک عجیب تاثر و خشیت کے عالم میں کچھ ایسا سمجھنے لگے۔ کہ گویا اب تک ان کا سارا وقت ضائع ہی ہوتا رہا۔ اور سیرۃ النبی کی تصنیف و تالیف سے وہ کوئی اور بڑی خدمت دین کی

کر ہی نہ سکے! سید صاحب کی یہ تشخیص مجھ بے علمے کی رائے میں صحیح نہیں، اور میں نے اسی ڈر سے انھیں بیعت ہو جانے کے مشورے پر زور نہیں دیا۔ عام معتقد رہنا اور چیز ہے اور باقاعدہ بیعت ہو جانا اور۔ بیعت ہو جانے پر انسان بالکل پابند ہو جاتا ہے۔ اور اپنی بڑی سی بڑی علمی تحقیق میں بھی پیر صاحب کا منھ دیکھتے رہنا پڑتا ہے۔ حضرت تھانوی کی نشر الطیب بھی بجائے خود ایک مرتبہ رکھتی ہے۔ لیکن علمی، تاریخی، تحقیقی معیار سے سیرۃ النبی اور نشر الطیب میں جو فرق ہے اسے کیسے مٹا دیا جائے۔؟

صوفی ہو جانے کے بعد ریاضتوں کا درجہ کہیں بڑھ گیا تھا۔ سید صاحب نیند کے ماتے ہمیشہ سے تھے۔ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کبھی شب۔ بیداری کے پابند ہو سکیں گے۔ لیکن عشق الٰہی نے آخر انھیں پورا تہجد گزار اور شب بیدار بنا کر چھوڑا۔!

ہائے دار المصنفین کے وہ کیا دن تھے اور کیا راتیں! کیسی کیسی علمی اسکیمیں پیش ہوتی رہتیں۔ بنتی تھیں اور بگڑ تی تھیں! کیسے کیسے علمی مسئلے زیر بحث ہوتے! —— گویا علم کی مملکت تھی اور قلم کی قلمرو! اور ہاں ایک نام اور یاد پڑ گیا۔ مولانا عبد الباری ندوی بھی برسوں اس خیالی پلاؤ کے پکاتے میں ہم لوگوں کے برابر شریک رہے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا کی ابتدائی اسکیم اس کا پورا خاکہ، اس کے شعبوں کی تقسیم، عنوانات کی تعیم در تقسیم۔ مضمون نگاروں کے نام، ان کے علاوہ کام کا خاکہ۔ یہ ساری تفصیلات پنسل سے لکھی ہوئی (سنہ ۱۹۱۶ء میں) شاید اب بھی میرے کسی کاغذی ذخیرے میں پڑی ہوئی مل جائیں! راجہ صاحب محمود آباد کے ایک وعدے نے مدتوں ہم لوگوں کو نشے میں رکھا۔

وفات ۱۹۵۳ء میں کراچی میں ہوئی۔ ہندوستان سے گئے ہوئے چند ہی سال ہوئے تھے۔ آخری زمانہ ہندوستان کا بڑا ہی حسرت ناک تھا۔ دار المصنفین اور ندوے میں ہر روز نیا فتنہ اور تازہ ابتلا۔ ایک روز مولانا عالم خواب میں تھے (نہ کہ عالم بیداری میں) کہ فرشتہ اجل نے آکر پیام موعود سنایا۔ اللہ کیسی کیسی آسانیاں اپنے مخصوص بندوں کے لیے پیدا کر دیتا ہے۔

سالار جنگ ثالث

(متوفی۔ ۱۹۴۷ء)

سالار جنگ اول حیدر آبادی وزیر اعظم کی شہرت سے کون ناواقف ہے؟ ایک دنیا ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور حسن تدبر کا کلمہ پڑھتی ہے۔ سالار جنگ دوم بھی مشاہیر وقت میں سے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے تذکرے میرے لیے صرف سنی ہوئی روایتوں کا حکم رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھ سے صرف سالار جنگ ثالث کو دیکھا ہے۔ یہ غیر شادی شدہ رہے اور اس بنا پر خاندان سالار جنگی کے خاتم۔ مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ جب میں ان سے ملا ہوں غالباً ۱۹۲۰ء میں تو وہ مدت ہوئی وزارت سے ہٹ چکے تھے، اور اب محض ایک خاندانی رئیس تھے۔ فراخ دل، روشن خیال، انگریزی گفتگو کے ماہر، انگریزی کتابوں، انگریزی ماحول کے شیدائی، انگریزی ادبیات خصوصاً انگریزی افسانے پر ان کی نظر خاصی وسیع تھی۔ میری عزت افزائی کھانے پر بلا کر انھوں نے کی، اور دلچسپ گفتگو کرتے رہے۔ میرے مخلص حیدرآبادی دوست امین الحسن بسمل موہانی اُس وقت ان کی ریاست کے ناظم (مینجر) تھے، اور انھیں نے میری رسائی ان تک کرائی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ کفایت شعاری میں جزرسی تک پہنچے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ تجربہ جو کچھ ہوا اس کے برعکس ہی ہوا۔ ایک بیش قیمت کلائی کی گھڑی خواہ مخواہ میری نذر کر دی۔ کتب خانہ باپ دادا کے وقت سے جمع کیا ہوا بہت اچھا تھا۔ اور اس میں خود ان کے وقت میں خوب اضافہ ہوتا رہا تھا۔ بڑے بڑے نادر بے بہا نسخے اس میں محفوظ تھے، میں بھی اپنے ظرف و استعداد کے مطابق اس سے مستفید ہوا۔ ایک آدھ کتاب کی نقل بھی وہاں سے بلا معاوضہ حاصل کی۔ اب سُنا ہے کہ گورنمنٹ کے

انتظام میں آگیا ہے۔ اور سالار جنگ میوزیم کے نام سے ایک سرکاری ادارہ بن گیا ہے۔ ماہنامہ معارف کے لئے میں نے سفارش کی۔ ایک خاصی معقول رقم اسی وقت عنایت کردی۔

سالہا سال کے بعد حیدرآباد میں ایک عزیز قریب کی شادی کی تقریب میں ملاقات ہوئی ۱۹۳۸ء میں۔ اب جوانی ڈھل چکی تھی، اور ادھیڑ سن کے ہو چکے تھے، میں نے پہچان تو لیا، لیکن تجاہل اختیار کیے ہوئے دوسری طرف دیکھتا رہا۔ اور صاحب سلامت کے بعد بھی ان کے پاس تک نہ گیا۔ یہ نفس کی محض شرارت بلکہ خباثت تھی۔ اور آج تک اس پر پچھتا رہا ہوں اللہ معاف کرے ــــــ اخیر عمر میں لوگ مخالف زیادہ ہو گئے تھے۔ اور قاسم رضوی مرحوم کی تحریک آزادی سے ان کا تصادم ہو گیا۔ اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ کرے یہ رسوائیاں اور صدمے ان کے لیے موجب نجات بن گئے ہوں۔

ڈاکٹر رفیع الدین

(متوفی سنہ ۱۹۶۹ء)

پنجاب کے کسی ضلع کے رہنے والے، ایم، اے، بعد میں پی ایچ ڈی ہوئے اور بہت بعد کو ڈگری ڈی لٹ کی حاصل کی۔ بڑے ہی پرجوش دیندار قسم کے مبلغ و مفکر، ان کا بس چلتا تو ساری دنیا کو مسلمان کر ڈالتے۔ کم سے کم تبلیغ تو سب ہی کو کرتے رہتے! پہلے کبھی مضمون ہلالہ کا (ڈان کراچی) وغیرہ میں دیکھ لیتا اور جی خوش ہو جاتا۔ پھر انھوں نے کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ زیادہ تر انگریزی میں۔ اور اقبال اکیڈمی کراچی میں قائم کر کے اس سے ایک سہ ماہی بھی انگریزی میں نکالنا شروع کر دیا ـــــ ۱۹۵۵ء میں کراچی میں ملاقات ہوئی اور مل کر جی بڑا خوش ہوا کہ کم سے کم ایک آدمی تو ذہنی و دماغی توی میں فرنگیوں کا ہم پلّہ موجود ہے۔ اقبال کے بعد یہی، جو اقبال کے کام اور پیام کو دنیا تک پہنچا سکتا اور اقبال ہی کی زبان اور لہجے میں گفتگو کر سکتا ہے۔

بڑا ہی صدمہ اخباروں میں یہ پڑھ کر ہوا کہ مرحوم کراچی میں کہیں رکشا پر چلے جا رہے تھے کہ دفعتاً رکشا الٹ یا لڑ گیا، مرحوم سڑک پر گرے اور دماغ پاش پاش ہو گیا۔ اچھے خاصے تندرست اور کام کرنے والے تھے کہ قدرت نے چشم زدن میں یوں موجود سے معدوم کر دیا۔ شرح صدر کے ساتھ تو نہیں، لیکن اک بھوں سکوڑ کر آخر مشیت کے فیصلے پر صبر کیا۔ کیا شان بے نیازی ہے کہ اپنے بڑے سے بڑے چاہنے والے اور مومن راسخ کو اس بے تکلفی سے بلا بھیجتے ہیں جس طرح کسی بڑے نافرمان کو!۔

سارے ہندوستان و پاکستان میں ایک شخص تو ایسا نظر آیا تھا جو علوم عقلیہ
کو مسلمان بنا رہا تھا اور اس کا انجام یہ ہوا ؎

ما بپروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

تین شفاء الملک

(متوفی (۱) ۱۹۵۱ء (۲) ۱۹۷۱ء (۳) ۱۹۷۰ء)

تین میں ایک تو میرے حقیقی خالہ زاد بھائی ہی تھے۔ نام حکیم عبدالحسیب (وفات ۱۹۷۰ء) سِن میں مجھ سے ۱۲، ۱۴ سال بڑے لیکن برتاؤ میں ایسے بے تکلف کہ جیسے ہم سن ہوں یا دو ہی چار سال بڑے۔

طب میں حذاقت اپنے خُسر اور ماموں حکیم عبدالعزیز دریابادی سے گویا وراثت میں پائی، اور ایک پشت اور آگے بڑھیے تو مقبولیت دہر دلعزیزی اپنے اور میرے نانا حکیم مولوی کریم دریابادی ثم لکھنوی (متوفی ۱۸۷۱ء بڑودہ) سے۔ انگریزی لکھنؤ کے کسی اسکول میں دو ہی چار درجوں تک پڑھ کر چھوڑ دی۔ اور طب جھنوائی ٹولہ سے پڑھنے لگے۔ جھنوائی ٹولہ کے طبیبوں سے ہمارے خاندانی تعلقات نانا صاحب مرحوم کے وقت سے چلے آرہے تھے۔ تعلقات بھی کیسے؟ گہرے اور مخلصانہ تعلقات، عزیزوں کے سے۔ ان کے اُستاد حکیم عبدالوحید ایک نامور معالج تھے۔ اس کے بعد کانپور جاکر طب زیادہ محنت اور شوق سے پڑھی، پھر آگرہ جاکر وہاں کے میڈیکل اسکول میں آنکھ کا کام ڈاکٹری طریق پر سیکھا۔ آدمی ذہین اور طبیعت دار تھے، طب میں جی لگ گیا۔ دریاباد میں آکر کام شروع کیا۔ نام خوب چمکا، میں تھا تو خوشحال گھرانے کا، لیکن اپنے ذاتی خرچ کے لیے بس کچھ واجبی ہی سا ملتا۔ کتابوں اور اخباروں کا رسیا بچپن سے تھا، ان کے لیے دام کہاں سے لاتا، بس یہی حکیم صاحب اس وقت آڑے آجاتے۔ اور اچھی خاصی خریداری میرے لئے کر ڈالتے۔ تھوڑی بہت سرسری نظر خود بھی کتابوں پر کر لیتے، اصلاً وہ میرے ہی کام میں رہتیں ــــ یہ احسان ان کا بھولنے والا نہیں!

سنہ ۱۹۱۰ء تھا کہ گرد و نواح میں شہرت حاصل کرنے کے بعد دریاباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے اور رفتہ رفتہ شہر کے نامور طبیبوں میں شمار ہونے لگے۔ آدمی بڑے ملنے ملانے والے تھے، اور بذلہ سنج۔ علم مجلس میں طاق۔ ہر ملنے والے سے گھل مل جاتے۔ رئیسوں اور بڑے حکام سے بھی اپنی آؤ بھگت کرالیتے۔ نماز روزہ وغیرہ کے پابند تھے۔ روزہ سفر کی حالت میں بھی نہ چھوڑتے اور اسلامی رسم و رواج کو بھی سختی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اور پھر بھی ہندوؤں سے بھی بڑا خلا ملا تھا۔ آخر میں جاکر حج بھی کر آئے تھے، اور تلاوت قرآن پابندی سے کرتے۔ طبی جلسوں میں یہ سب سے پیش پیش رہتے۔ صوبے کی طبی مجلس کے پہلے ممبر ہوتے اور پھر صدر ہوکر رہے۔ مختلف کمیٹیوں کے بھی صدر ہوتے رہے۔ آخر میں "شفاء الملک" بھی ہوگئے۔ اس وقت یہ اعزاز کی چیز تھی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی کے ہاں بھی خوب رسائی ہوگئی تھی۔

کھانے پینے کے شوقین تھے۔ خوب کھاتے اور خوب کھلاتے۔ اپنے قصبے کے غریب غربا کا بڑا خیال رکھتے۔ قرضہ دلوا دیتے، کاروبار سے لگوا دیتے، نوکری کے لئے بھی سفارش کر دیتے اور کچھ نہ سہی تو کم سے کم اپنے ہاں مہمان تو ضرور ہی رکھتے۔ لکھنؤ میں یہ ضرورتیں کس کو نہیں رہتیں۔ یہ سب کے حاجت روا۔ ایک مرجع خلائق تھے۔ فیس کے معاملے میں بڑے ہی بامروت تھے۔ خدا معلوم کتنوں کا علاج مفت ہی کرتے۔ کتب خانہ اچھا خاصا ورثے میں مل گیا تھا۔ قلمی کتابیں بعض نادر قسم کی بھی تھیں۔ انھیں ضرورت سے زیادہ عزیز رکھتے۔ نااہل اور ناقدرے وارثوں نے یہ سارا ذخیرہ ضائع کر دیا اور علم و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا۔ ہزارہا ماہوار کی آمدنی ہوگئی تھی۔ طب یونانی کی ترقی کے لیے کام سرکاری و غیر سرکاری دونوں طریقوں پر ایسے ایسے کیے تھے، کہ معاصر طبیبوں نے مل کر اور ایک جلسہ کرکے خطاب "محسن طب" کا پیش کیا ——— انتقال سنہ ۱۹۵۱ء میں گویا دفعتاً حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوا۔

سکرات کی آمد محسوس ہوئی، تو آیۂ کریمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

کا ورد شروع کر دیا۔ اور اس پر شبِ جمعہ میں روح نے جسم سے مفارقت کی۔ بعد غسل کفن پوش حالت میں میں نے دیکھا، چہرے پر بڑی رونق، بشاشت اور بہار تھی۔ بس یہ لگتا تھا کہ خوب آرام کی نیند سو گئے ہیں۔ نماز جنازہ پہلے لکھنؤ میں ہوئی، دوبارہ دریاباد میں بہت بڑی جماعت کے ساتھ۔

(۲) دوسرے شفاء الملک تھے حکیم حافظ خواجہ شمس الدین احمد (ولد خواجہ قطب الدین احمد، مالک نامی پریس نخاس، لکھنؤ) سن میں مجھ سے دو چار برس چھوٹے تھے۔ اور میرے بڑے ہی قدر افزا۔ میری تفسیر قرآن کی مدح و تحسین میں مبالغے کی حد کر دیتے۔ مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کے مستند عالم، بڑے زبان آور اور خوش تقریر، علوم منقول و معقول دونوں کے ماہر۔ لکھنؤ کے نامی گرامی طبیب۔ موٹر نشین ہونے کے باوجود، پیدل چلنے کے شدت سے پابند اور کھانے پینے میں انتہائی احتیاط کرنے والے۔ شاید چپاتی اور سادے قورمے کے سوا اور کچھ کھایا ہی نہیں، اور وہ بھی قلیل مقدار میں۔ اور بارہ گھنٹے کے فصل کے بعد! مجھے ایک نیا لفظ ان کے لئے گڑھنا پڑا تھا، پرہیزکار، (گ سے نہیں، بلکہ "ک" سے)۔ عربی، فارسی، اور اردو تینوں پر نظر بڑی وسیع، حافظہ بہت اچھا۔ ذہانت بھی کسی سے کم نہیں۔

بیعت فرنگی محل ہی میں مولانا عبدالباریؒ سے سلسلۂ قادریہ میں کی تھی۔ آخر میں مسلک دیوبند کی طرف بہت کھنچ آئے تھے اور حاجی شاہ وصی اللہ اشرفی سے غالباً خلافت بھی حاصل ہو گئی تھی۔

لکھنؤ کے خصوصی فن ضلع جگت یا مراعات النظیر کے استاد تھے۔ اخیر میں حلق میں کینسر ہو گیا، پہلے چھوٹے بھائی خواجہ قمر الدین (آنریری مجسٹریٹ) کو ہوا۔ پھر ان کو بھی یہی مرض ہو گیا۔ اللہ کی مشیت و مصلحت میں کس کو دخل، بڑی تکلیف اٹھائی۔ بار بار علاج کے لئے بمبئی گئے۔ ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔

ذاکر، شاغل، عابد و ساجد تھے۔ ظرافت و بذلہ سنجی میں بھی شفاء الملک حکیم عبدالحمید سے

کم نہ تھے۔

(۳) تیسرے شفاء الملک میرے ملنے والوں میں جھنوائی ٹولے کے ذی علم حکیم عبداللطیف تھے۔ شروع میں فلسفے سے بڑا ذوق تھا، اس لیے "فلسفی" کہلائے۔ مطالعۂ علوم کا شوق اخیر تک برقرار رہا، مدتوں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرنسپل، پھر دہلی میں بھی اعلیٰ طبی عہدوں پر رہے۔ اخیر کے کئی برس لکھنؤ میں آکر پھر مطب شروع کیا۔ اور اپنے بڑے بھائی شفاء الملک حکیم عبدالمعید کے ساتھ خود بھی اطبائے شہر کے سرخیل ہو گئے۔ مجھ سے کمال محبت رکھتے تھے، میں بھی جب بیمار ہوتا تو حکیم عبدالحبیب صاحب کے اور ڈاکٹر عبدالعلی صاحب دونوں کے گزر جانے کے بعد اب لکھنؤ آکر انھیں کا علاج شروع کرتا۔ خواہ اس علاج میں کتنی ہی مدت لگ جاتی۔

اوپر لکھ آیا ہوں کہ جھنوائی ٹولے کے طبیبوں اور ہمارے خاندان سے رشتۂ یگانگت واختصاص کا دو تین پشتوں سے چلا آرہا تھا۔ ان حکیم صاحب نے گویا اس کی ازسرنو تجدید کی، فیس وغیرہ تو خیر مجھ سے کیا لیتے، سواری کا کرایہ تک نہ لیتے۔ صبح کا ناشتہ بڑے تکلف سے کرا دیا کرتے۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں بعارضہ قلب وفات پائی۔

فنی بحیثیت جو کچھ بھی ہوں، مجھے طبعی ذوق یونانی ہی حکیموں سے علاج کرانے کا تھا، اور میرے لئے اب ان تینوں کے اٹھ جانے کے بعد طب یونانی لکھنؤ سے گویا رخصت ہی ہو گیا ہے۔ حالانکہ اب بھی لکھنؤ کے موجودہ طبیبوں میں میرے مخلص موجود ہیں۔ اور ان تینوں سے پہلے شفاء الملک حکیم عبدالحمید جھنوائی ٹولوی بھی میرے بڑے کرم فرما تھے۔ ترتیباً ان کا نام سب سے پہلے آنا تھا۔ اور خود اس باب کے عنوان میں شفاء الملکوں کی تعداد بھی تین کے بجائے چار ہوتی۔

آٹھ چھوٹے

آٹھ چھوٹے

(۱) مولانا محمد اویس نگرامی۔

(۲) علی میاں۔

(۳،۴) رئیس احمد و عقیل احمد جعفری۔

(۵) شوکت تھانوی۔

(۶) عبد الرحمان ندوی نگرامی۔

(۷) سراج الحق مچھلی شہری۔

(۸) انیس احمد عباسی۔

مولانا محمد اویس نگرامی

(متوفی سنہ ۱۹۷۶ء)

نگرام ضلع لکھنؤ متصل رائے بریلی کے رہنے والے، اور ایک مشہور علمی و دینی خاندان کے رُکن، اپنے چھوٹوں میں مجھے علمی و دینی حیثیتوں سے بہت ہی عزیز۔ عرصہ دراز سے ندوہ میں شیخ التفسیر ہیں۔ اور اس سے قبل کئی سال دار المصنفین میں مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی میں کام کر چکے ہیں، اور ان سے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ چکے ہیں۔ ندوی ابن ندوی ہیں۔ والد جوار کے ایک ممتاز عالم تھے، اور دادا ان سے بھی بڑے ٹکسالی عالم، صاحب تفسیر آیات الاحکام۔ اب یہ اسی چھپی ہوئی تفسیر کی تہذیب و ترتیب از سر نو کر کے چھاپ رہے ہیں ابن قیمؒ کے تفسیری اقوال جابجا سے انتخاب کر کے اور ترتیب دے کر تفسیر القیم کے نام سے کئی سال ہوئے شائع کر چکے ہیں۔

میرے مُخلص بے تکلف دوستوں میں ہیں۔ اور ان کی دینی و علمی محبت میری ذات سے گزر کر تفسیر ماجدی تک سرایت کر چکی ہے۔ کلام اللہ کو تو چھوڑیے، باقی کلام الناس میں سے کسی کتاب کی مدح اتنی کم ہی ہوئی ہو گی جتنی ان کی زبان سے اس ذرّہ بے مقدار کی کتاب کی ہو چکی ہے۔ اگر ان کا اور مولانا عبد الباری ندوی کا بس چلتا، تو شاید دونوں مل کر اس کتاب کو نصاب میں لازم قرار دے دیتے یا اور جو کچھ جی چاہتا، تو وہ بھی کر گزرتے حُسنِ ظن کے بھی کتنے درجے اور مرتبے ہوتے ہیں!

علامہ سلیمان ندوی کے درسِ قرآن سے بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ذہین، طباع شایق علم شروع سے تھے۔ تقریر کی مشق بھی ابتدا ہی سے تھی۔ معارف میں مضمون خصوصًا دینی قسم

کے لکھے ہیں۔ سلجھاؤ اور سلاست اب قلم کے خاص جوہر ہیں۔ دار المصنفین اور دار العلوم ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں اور دونوں کی رکنیت کے سزاوار ہیں۔ سرکار ہند سے ایک علمی پنشن ۳ ہزار سالانہ کی ان اہل قلم کو ملتی ہے، جنہوں نے عربی زبان یا عربی علوم کی قابل لحاظ خدمت کی ہے۔ میرا بس چلتا تو یہ پنشن ان کے نام آنکھ بند کر کے جاری کرا دیتا۔

علی میاں

(پیدائش سنہ ۱۹۱۲ء)

مرحوم نہیں، ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں اور خدا کرے خدمت دین و ملت کے لیے مدتوں اس خاکدان کو زندہ و سرسبز رکھیں۔ سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں، لیکن علم و فضل میں، سنجیدگیٔ فکر میں، اخلاص میں، اخلاق و تقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت و طاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل۔ رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور بھی لوگوں سے میں واقف ہوں۔ باپ اور بھائی کا کیا کہنا، دونوں نورٌعلیٰ نور پاک صاف، طاہر و مطہر۔ مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) اس سے بنے ہوئے۔ دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر و قابل فخر ——— یہ اُس تاروں کے جھرمٹ کے درمیان آفتاب!

ندوہ اور دیوبند ماشاء اللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا، اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے (اور انھیں میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں) اخلاق و روحانیت کا سبق لیا۔ ذکاوت و فطانت کے پتلے پہلے سے تھے، چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے۔ انگریزی بھی بقدر ضرورت تحصیل کرلی۔ اور عربی ادب و انشا میں تو ہندوستان اور عالم اسلام میں نام پیدا کرلیا ہے۔ خود اردو شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق رکھے ہوئے۔ شامی و مصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کرلی۔ تقریر و حکایت میں ملکہ روانی تحریر سے بھی زاید۔ میری طرح کاہل اور جامد نہیں، ندوے کے سب سے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں، اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ۔ ابھی یہاں ابھی وہاں، اور مقالات و تصانیف

ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹا کھٹ نکلتی چلی آرہی ہیں ۔ اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی بلکہ کسی حد تک ترکی میں بھی ——— زندگی قابل داد بھی، قابل رشک بھی!

خود مجھے اپنے معاملہ میں "بخل" یا تواضع بے جا کی شکایت البتہ ہے ۔ ایک بار نہیں، شاید دو ایک بار، اور اشارتاً و کنایتاً نہیں ۔ منھ پھوڑ کر پوچھا کہ حضرت شاندار مصطلحات تصوف کا مفہوم کچھ تو ہم نیازمندوں پر کھولیے، اور "تنازل ستہ" کے چہرے سے نقاب ذرا تو سرکایئے "توجہ باطن" سے قلب کو گرمایئے ۔ کچھ جواب نہ ملا ۔ تجاہل سا کر کے ٹال گئے ——— ایسا تجاہل جو دانستہ تغافل سے کم نہیں!

اتنے کام مختلف قسم کے اپنے سر لے رکھے ہیں، کہ کوئی ان کی مفصل فہرست ہی بنائے تو یہی ایک کمال ہے ۔ مختصر یہ کہ سیاسیات ملّی، اور کلام، تاریخ اُمت، اور سوانح اکابر و اسرار شریعت پر تو خاصا کام کر چکے ہیں، بلکہ مبتدیوں کی حد تک تو عربی ادب و انشا میں بھی ۔

میں اپنے وصیت نامے میں لکھے جاتا ہوں کہ میرے وقت موعود کے آجانے پر پہلے تلاش ان ہی کی کی جائے اور اگر یہ مل جائیں تو جنازہ پڑھانے کے حق دار نمبر اول یہی ہیں۔[۱]

دُنیا انھیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کہہ کر پکارتی ہے ۔ ہم لوگوں کی زبانوں پر خالی علی میاں ہیں، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز ۔

---

[۱] وصیت پوری ہو کر رہی ۔

رئیس احمد و عقیل احمد جعفری

(متوفی (۱) ۱۹۶۸ء (۲) ۱۹۷۱ء)

یہ کسی فرم کا نام نہیں، محض دو بھائیوں کے نام ہیں۔ رہنے والے سیتاپور (اودھ) کے تھے۔ ننھیال خیرآباد ضلع سیتاپور تھا۔ وطن مشہور قصبہ خیرآباد ہوا۔ نواسے مشہور شاعر ریاض خیرآبادی کے تھے۔ رئیس احمد چھوٹے بھائی نے ندوے میں تعلیم پائی۔ بڑے ہونہار تھے۔ ذہین و طباع، علم و عمل دونوں کے شوقین۔ طالب علمی ہی میں بہت کچھ لکھ پڑھ ڈالا، پھر دلی جامعہ ملیہ میں گئے اور وہیں سے بمبئی منتقل ہو گئے اور اخباری لائن اختیار کر لی۔ علاوہ دوسرے پرچوں کے روزنامہ خلافت میں بھی کئی برس رہے۔ پھر پاکستان بنتے ہی پاکستانی ہو گئے۔ علی برادران کے گردیدہ و شیدائی۔ محمد علی پر "سیرت محمد علی" لکھ ڈالی۔ اور بڑی بھلی جیسی بھی ہو اب تک وہی غنیمت ہے۔ ابھی ندوے میں تھے اور "سچ" نیا نیا نکالا تھا کہ خواہ مخواہ میرا جادو چل گیا۔ میری عقیدت میں بیچارے مبتلا ہو گئے۔ کچھ اعتراضات بھی اپنا نام بدل کر ایک خط میں کیے۔ جواب پا کر کہ ملاقات کو آئے۔ رفتہ رفتہ مخلص سے مخلص تر ہوتے گئے۔ مجھ کو اپنا ہادی و مقتدا سمجھنے لگے، اور بڑے کام کے نکلے۔ میرا انگریزی ترجمہ قرآن (حواشی تفسیری) تیار ہو گیا تو پبلشر کوئی ہاتھ نہ آتا تھا۔ انھیں بے چارے نے تاج کمپنی (لاہور) سے تعارف کرایا۔ اور معاملت کی منزلیں طے کرائیں۔ ۱۹۵۵ء میں میرا جانا پاکستان ہوا تو ہر طرح فرش راہ بنے رہے۔ بچھے جاتے تھے۔ اپنی والی پوری کوشش میرے مستقل قیام پاکستان کی کر ڈالی کچھ دن بعد خود لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔

مجھ سے چھپ چھپا کر خدا معلوم کتنے ناول اور افسانے لکھ ڈالے، کچھ کتابیں تاریخ پر

بھی شاید لکھ گئے۔ کام بہت ہی تیز اور کم سے کم وقت میں کر ڈالنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اسلئے قدرتاً موشگافی و تحقیق کے بجائے سطحیت اور سرسری پن پیدا ہو گیا۔ ایک کتاب دید و شنید کے نام سے ہے۔ جس میں میرا ذکر بڑے مبالغے کے ساتھ کیا ہے۔ اس درجے کے مخلص بس قسمت ہی سے ہاتھ آتے ہیں۔ میں جب ان کی مسلسل پیہم عنایتوں کا خیال کرتا ہوں تو کٹ کٹ کر رہ جاتا ہوں۔ صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اس لئے کہنا چاہیئے کہ بہت قبل از وقت دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اپنی ماں کے بڑے ہی مطیع اور لاڈلے تھے۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔

عقیل احمد جعفری بڑے بھائی کا نام تھا۔ عقیل شاعر تھے اور شاعر بھی شاعر اسلام۔ جوش ملیح آبادی کے ملحدانہ ہفوات کا جواب ترکی بہ ترکی دیتے تھے۔ ۵۱ جوابات کا ایک رسالہ جوش و ہوش کے نام سے چھپ بھی گیا۔ آدمی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن کڑھے خوب تھے، جب تک خیرآباد میں رہے عزت کے ساتھ قصبے کی میونسپلٹی کے چیرمین رہے آخر میں پاکستان چلے گئے، اور کراچی میں کسی سرکاری محکمے سے متعلق ہو گئے۔ میرے ساتھ اخلاص اور تعلق قلب میں رئیس مرحوم سے کم نہ تھے۔ رئیس کے کچھ دن بعد خود بھی وفات پا گئے۔ اللہ محبت کی پوری جزائے خیر دے۔ دونوں کی والدہ خاصی پڑھی لکھی اور سخت مذہبی قسم کی تھیں دونوں کو خوب تربیت سے لگایا تھا۔

شوکت تھانوی

(متوفی سنہ ۱۹۶۳ء)

اُردو نثر میں ظرافت یا مزاحیہ ادب کی بنیاد تو اودھ پنچ (سنہ ۱۸۷۷ء) نے ڈالی اور اس نے اسے خوب پھیلایا۔ کوئی ۲۰، ۲۲ سال کی مدت تک منشی سجاد حسین کا کوروی یوں تو آدمی مہذب، شائستہ و منتعلیق تھے۔ لیکن صحافت کے حمام میں داخل ہو کر وہ گویا ننگے ہو جاتے پھکڑ کی نوبت تک تو خیر نہ پہنچنے پاتی، لیکن اور حیثیتوں سے سطح بالکل پست اور عامیانہ ہو کر رہتی۔ اور ان کی ظرافت اور بھانڈوں کی بولی ٹھولی میں کوئی فرق ہی نہ رہ جاتا، آج اسے منھ چڑھا دیا۔ کل اس پر تُو تُو بول دیا، پرسوں اس کے چٹکی لے لی۔ بکوٹا بھر لیا۔ کہیں اس کے وطن پر پھبتی ہے کہیں اس کے نسب پر تضحیک۔ اور فلاں کی شکل و صورت، قد و قامت اور جلد کے رنگ کو چوپخ دکھا دی! —— بیسویں صدی کے پہلے دہے میں میر محفوظ علی بدایونی (علیگ) ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اس رنگ کے بجائے مہذب، شریفانہ اور شائستہ ظرافت کی طرح ڈالی۔ پھر ولایت علی بمبوق (علیگ) اسے لے اڑے، مگر زیادہ تر انگریزی میں، پھر اور لوگ بھی پیدا ہوئے، خصوصاً علی گڑھ کے رشید صدیقی، لیکن ظرافت میں سب سے زیادہ جس نے نام کیا اور جس نے خوب ہی ہنسایا، خوب ہی گدگدایا، ٹھٹھے لگوا دیے اس کا نام شوکت تھانوی ہے۔ نام اصلی تو محمد عمر تھا۔ لیکن اسے اب کون جانتا ہے —— شوکت تھانوی ابتداءً اخبار نویس تھے۔ پہلے متعدد اخباروں میں کام کیا اور پھر اپنا اخبار نکالا۔ اور نام جب خوب پھیل لیا تو پاکستان چلے گئے، اور لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ بہت زیادہ لکھا اور اس سے بڑھ کر ریڈیو میں کام کیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو بول جاتا، اس کی ذہانت اور شوخی کا دیوالہ نکل جاتا

اور ظرافت کے سوتے خشک ہو جاتے۔ لیکن شوکت کی ظرافت بے پناہ اور اتھاہ تھی ایسا لکھتے اور بولتے کہ دوسرے دنگ رہ جاتے۔ اور اس پر کمال یہ کہ بڑی فیاضی سے دوسروں کو لکھ لکھ کر دے دیتے! اور شاید ایسی باتیں جو خود کہنا اپنی شرافت، وضع داری کے خلاف سمجھتے، دوسروں کی زبان سے کہلا دیتے۔ واللہ اعلم۔

خدا معلوم اس کم سواد پر اتنے مہربان کیسے ہو گئے تھے، خط تو خیر پھر خط ہیں، اپنی پبلک تحریروں میں ذکر خیر کثرت سے کر گئے ہیں اور ایک مقالہ ''مدظلہٗ'' کے نام سے شاید اس گم نام پر لکھ گئے ہیں۔

لاہور جا کر بظاہر بڑے چین سے تھے۔ ایک دوسری شادی کی اور بڑے عیش کے ساتھ خوش و خرّم بسر کر رہے تھے کہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور مرض کے شدید واشد مرحلے مہینوں طے کرتے رہے۔ آخر کا زمانہ بڑا ہی حسرت انگیز گزرا۔ صدق میں ایک آدھ بار نوٹ بھی اس عنوان سے لکھنا پڑا ''ہنسوڑ کے آنسو'' ہنسی کی افراط کا کفارہ یقیناً اس آہ و بکا نے کر دیا ہوگا۔ اور اللہ کی ستاری نے اس بندے کی عبدیت کی لاج رکھ لی ہو گی۔

عبدالرحمٰن ندوی نگرامی

(متوفی ۱۹۲۶ء)

معصوم، مذہبی اصطلاح میں نہیں، بلکہ اردو کے عام محاورے میں، اپنی زندگی میں صرف تین ہی دیکھنے میں آئے۔ یعنی ایسے سلیم الفطرت اور اس درجہ نیک و صالح کہ گویا دانستہ معصیت ان کے پاس پھٹکنے بھی نہیں پائی۔ ان تین میں ایک تو خود میری ہمشیر مرحومہ تھیں۔ دوسرے ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم تھے، اور تیسرے یہی عبدالرحمٰن ندوی مرحوم تھے۔

ضلع لکھنؤ کے قصبہ نگرام میں ایک صالح خاندان میں پیدا ہوئے۔ علم ظاہری و باطنی گویا ورثے میں ملا۔ لڑکپن ہی سے ذہین، شائق علم، ذکی، سلیم الفطرت، صالح، ہونہار تھے۔ ندوے میں پڑھنے لکھنؤ آئے۔ خوب جی لگا کر شوق سے پڑھا اور لکھنؤ جن صحبتوں کے لیے بدنام ہے۔ اس نوعمری میں بھی بچے رہے۔ اس کم سنی کے زمانے میں لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں مسلمانوں کے کسی مسئلے پر پبلک میٹنگ تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس بھرے مجمع میں ندوے کا یہ لڑکا خوب بے جھجک اور رواں تقریر کر رہا ہے۔ اسی وقت سے یہ میری نظر پر چڑھ گئے۔ جلدی جلدی پڑھ لکھ کر فارغ ہوئے۔ ندوی عالم کہلائے اور علم سے بڑھ کر اخلاق و ایمان میں ممتاز ہوئے۔ غصہ کرنا تو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ ایک ایک سے تواضع، انکسار، شفقت سے پیش آتے۔ ہر چھوٹے بڑے کے آگے بچھے جاتے۔ قرآن مجید سے خاص شغف تھا حدیث پر بھی نظر اچھی خاصی تھی۔ عربی زبان میں بے تکلف لکھنے اور بولنے دونوں پر قادر تھے۔

ندوے سے فارغ ہوکر سرائے میر (اعظم گڑھ) کے مدرسۃ الاصلاح میں چلے گئے، یہاں فاضل عصر مولانا حمید الدین فراہی صاحب نظم القرآن سے استفادہ کا خوب موقع مل گیا جو قرآنیات کے ماہر خصوصی تھے۔ یہ زمانہ غالباً ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء کا تھا۔

اسی اثنا میں ملک میں خلافت و ترک موالات کی تحریک بڑے زوروں سے چلی، مدرسے پر مدرسے بند ہونے لگے۔ نئے نئے پرچے اور اخبار جاری ہونے لگے۔ مولانا ابوالکلام نے سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک اخبار پیام کے نام سے نکالنا چاہا اور اس کے لئے نگرامی مرحوم کو اپنے ساتھ کلکتے لے گئے۔ نگرامی اس کے لیے بہت موزوں ثابت ہوئے۔ خلافت کے ہنگامۂ رستخیز میں پریس تک کا قائم رہ جانا ناممکن تھا۔ پرچہ بند ہوا اور مولانا ابوالکلام کی طرح یہ نگرامی بھی اسیر قید فرنگ ہوئے، اور اس درمیان میں طرح طرح کی مصیبتیں بخندہ پیشانی جھیلے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک نہیں، دو دو تین تین وقت فاقے سے گزر گئے! اور اس سے کم درجے کے اتفاق تو بار بار پیش آئے۔ مجال کیا جو کبھی جبین ہمت و استقلال پر شکن آجائے۔

قید سے چھوٹے (شروع ۱۹۲۲ء میں) تو اپنے پرانے دارالعلوم ندوہ میں مُدرّس ہوکر آئے۔ اُستادوں میں سب سے چھوٹے تھے، قد کے لحاظ سے بھی اور عمر کے لحاظ سے بھی، لیکن چند ہی روز میں بڑے بھی انھیں اپنا بڑا ماننے لگے —— علم و فضل صلاح و تقویٰ، تواضع و مسکنت، ایثار ہر لحاظ سے مستحق بھی اسی کے تھے۔ ہر وقت خندہ رو رہتے ہر ایک کی خدمت کر کے خوش ہوتے، اپنے ندوی ہونے پر فخر کرتے، اور اس سے زیادہ خود ندوہ اُن پر فخر کرتا۔ اتنا بے لوث، اتنا بے شر، دنیوی آلودگیوں سے اتنا بلند و برتر نمونۂ انسانیت کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے —— بے ہمہ و باہمہ کی عملی تفسیر!

ندوے میں شاید پچاس روپے کا مشاہرہ پا رہے تھے۔ اور خاص خاص حلقوں میں معروف و متعارف ہو چکے تھے، کہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایک مانگ چارسو ماہوار کے مشاہرے

کی آئی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نام سنتے ہی ٹوٹ پڑتا۔ اور درخواست پر درخواست، بھیجنے اور سفارش پر سفارش اٹھوانے لگتا، یہ حضرت خبر ہی نہ ہوئے، چپکے سے انکار کر دیا۔ اور پھر جیسے یہ کوئی واقعہ قابل ذکر بھی نہیں، اس کا تذکرہ تک، اپنے دوستوں رفیقوں سے نہ کیا! ــــــ ایسی بے نفسی کی مثالیں بیسویں صدی میں تو شاذونادر ہی ہیں۔

اخیر ۱۹۲۴ء میں ظفر الملک صاحب علوی کاکوروی، مالک الناظر پریس کے مشورے سے یہ طے پایا کہ لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اصلاحی پرچہ نیم سیاسی، نیم مذہبی سچ کے نام سے سلیس زبان میں اور عام فہم انداز بیان سے نکالا جائے۔ پرچہ شروع ۱۹۲۵ء سے جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر تین قرار پائے۔ ایک خود ظفر الملک، دوسرے میں، تیسرے یہی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی۔ مضمون ہم تینوں لکھتے، مذہبی عنوانات پر زیادہ تر نگرامی مرحوم ہی قلم اٹھاتے اور لکھنے کا حق ادا کر دیتے۔ بولتے بھی خوب تھے، وعظ سادہ ہوتا مگر مؤثر اخچہ از دل خیزد بردل ریزد، کا مصداق۔ تکلف و آورد کے ہر اہتمام سے پاک۔ ۱۹۲۵ء میں ایک بار دریاباد بھی اسی وعظ گوئی کے سلسلہ میں آئے اور اپنے بیان سے اچھا اثر چھوڑ گئے۔ لکھنؤ میں ملاقاتیں کثرت سے ہوا کرتیں، اور دینی، سیاسی، اخلاقی مباحث پر گفتگوئیں گھنٹوں جاری رہتیں، ــــــ آہ وہ اخلاص کی پر لطف گھڑیاں! ــــــ مولوی عبدالرزاق خاں ندوی ملیح آبادی جو بعد کو کلکتے جا کر اور رہنا نکال کر کچھ سے کچھ ہو گئے اور بجائے "مولانا" اور "ندوی" کے صرف ملیح آبادی، رہ گئے تھے۔ وہ بھی اس وقت کی صحبتوں کے شریک خاص تھے، اور اس وقت تک بڑے مہذب، متین و شائستہ تھے۔

شروع ۱۹۲۶ء میں نگرامی کچھ معمولی سے بیمار ہوئے اور اپنے ایک عزیز کے پاس جو طبیب بھی تھے، بہرائچ چلے گئے۔ بیماری کو کئی ہفتے گزر گئے۔ اس پر بھی کسی خطرے کو کوئی خاص اہمیت نہ سمجھی گئی۔ بس یہی معلوم ہوتا رہا کہ ٹانگ میں درد ہے اور نماز کھڑے ہو کر پڑھنے سے معذوری ہے۔ ۶ر مارچ کی صبح ہی کو نماز فجر کا سلام پھیرا، تو

معاً فرشتۂ اجل کو حاضر پایا۔ ماں کی گود میں لیٹ گئے اور آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کرلیں۔ ع

مرگے کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند!

اتفاق سے اسی دن مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے میں شرکت کے لیے لکھنؤ اترتا ہوا دہلی جارہا تھا لکھنؤ خاتون منزل پہنچا، تو ظفرالملک نے یہ خبر سنائی۔ یک بیک خبر سن کر بجلی سی گر پڑی! انا للہ ثم انا للہ۔

معلوم ہوا کہ نعش اسی وقت بہرائچ سے نگرام کے لیے لکھنؤ سے گزرے گی۔ اسٹیشن گیا، نعش لاری سے جا چکی تھی۔ اس ریل پر محض عورتوں کا لٹا ہوا قافلہ سوار تھا — غسل میت، دارالعلوم ندوہ کے شیخ الحدیث، اور شیخ وقت، مفتی حیدر حسین خاں ٹونکی مرحوم نے اپنے ہاتھ سے دیا۔ کچھ روز بعد خاص اسی مقصد سے سفر کر کے نگرام گیا، اور قبر پر جا کر فاتحہ پڑھا، کچی تربت پر عجب بہار پائی! — ظاہر کی آنکھیں بہت روئیں، دل کے کانوں نے بہت کچھ سُنا۔

عمر کل ۲۰ سال کی پائی۔ پیدائش ۱۸۹۹ء کی تھی۔ مجھ سے سات سال چھوٹے تھے۔ ایک لڑکی چھوڑ گئے تھے، بڑی پیاری بچی تھی۔ سیانی ہو کر شادی سے قبل وہ بھی گزر گئی۔

تقدیر اور تکوینی حالات پر کس کا زور چلا ہے۔ مرحوم کی وفات کے کوئی پانچویں سال مرحوم کی بیوہ کا عقد ثانی اِس نامہ سیاہ کے ساتھ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ نباہ نہ ہو سکا اور چند ہی ماہ بعد نوبت طلاق کی آگئی — قدرت کے عجیب کارخانے ہیں۔ کوئی عمل کیسی ہی نیک نیتی اور ہمدردی کے جذبے سے کیا جائے، حالات تکوینی اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں، اور پھر قصور کسی متعین فرد پر عائد کرتے نہیں بنتا۔ طلاق کے کوئی ۱۰ سال بعد جولائی ۱۹۴۱ء میں وہ مرحومہ بھی سفر آخرت اختیار کر گئیں۔ اللہ سے

امید لگائے ہوں کہ طلاق و افتراق کے باوجود بھی مرحومہ مجھ سے ناخوش اور فریادی نہیں گئیں۔

مرحوم کا ایک مختصر لیکن دلچسپ و کار آمد رسالہ محمدؐ نامی ہے، اُسے میں نے اپنی اردو تفسیر القرآن کی طبع اول میں، سورۂ آل عمران کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل کر لیا تھا۔ مرحوم کے اور مضامین و مقالات کا مجموعہ بھی اگر مرتب ہو کر شائع ہو جائے تو گو مُصنف اب نظر ثانی اور ترمیم و اصلاح کے لیے زندہ نہیں پھر بھی نفع سے خالی نہ ہوگا۔

مولوی سراج الحق مچھلی شہری

(متوفی ۱۹۷۷ء)

ان سے ملاقات ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں حضرت تھانویؒ کی خانقاہ امدادیہ میں ہوئی۔ یہ خانقاہ ہی میں مقیم تھے، اور مولانا نے ان کو تربیت کے لیے اپنے ایک خلیفہ اجل مولوی محمد علی صاحب استاد انٹر کالج الہ آباد کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ خود بھی شاید اسی درسگاہ میں مدرس تھے۔ خود بھی پڑھے لکھے تھے۔ ایک ذی استعداد مولوی، انگریزی داں بھی تھے۔ خانقاہ نشینوں کی تنگ نظری سے ان کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ میری صحبت بہت ہی غنیمت معلوم ہوئی۔ شاعر اس وقت بھی تھے۔ اور بڑے شوخ مزاج تھے۔ اقبال کے شیدائیوں میں تھے۔ اقبال کا نام بھی دوسرے خانقاہ نشیں نہیں برداشت کر سکتے تھے — میں تھانہ بھون کے کئی ہفتوں کے قیام میں الگ مکان لے کر رہتا۔ اچھے خاصے گنجائشی اور آرام دہ مکان حیرت انگیز سستے کرائے پر مل جایا کرتے۔ ان سے میرا دل کھل گیا تھا۔ گھنٹوں بات چیت ہر قسم کی ہوا کرتی۔ انھیں نے بار بار کہہ کر مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں انگریزی ترجمہ قرآن مجید کا کر ڈالوں۔ کہا کرتے کہ کچھ ہرج نہیں، اگر محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن سامنے رکھ کر اُس میں جا بجا ترمیم و تصرف کر دیجئے۔ اہل سُنّت کی طرف سے ایک ترجمہ تو انگریزی میں آجائے — اور بار بار کہنے کا یہ اثر ہوا کہ میں پہلے نیم راضی اور کچھ عرصے کے بعد پوری طرح آمادہ ہو گیا۔ یہ خدمت چاہے وہ جس بے ڈھنگے پن سے بن پڑی ہو، اگر اس کا کچھ اجر ہو گا، تو انھیں بہ حیثیت محرک اس کا حصہ ضرور ملے گا۔

تھانہ بھون کے بعد الہ آباد میں ان سے بار ہا ملاقاتیں رہیں، لکھنؤ میں بھی ہوئیں۔

اور مراسلت بھی قائم رہی۔ یہ برابر علمی، عملی، دینی روحانی ترقیاں کرتے گئے۔ اور آخر میں حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے خصوصی مقربین میں ہو گئے۔ ذہین، فطین، محنتی ہمیشہ سے تھے۔ اب علم دین پورا حاصل کر لیا۔ انگریزی میں بھی خوب منجھ گئے۔ خوب خوب شعر ان کے دماغ سے ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے۔ اور توحید و معرفت میں شعر بڑے پایہ کے کہنے لگے۔

فرقۂ شیعہ کا رد کرتے کرتے، شاید حدود سے تجاوز کر گئے۔ اور غلو و اغراق کے حدود میں داخل ہو گئے۔ ماشاء اللہ زندہ سلامت[1] ہیں، اور اب اردو میں مستقل دینی چیزیں نثر میں برابر لکھتے رہتے ہیں، اور شعر گوئی کا مذاق بھی ترقی پر ہے۔ حضرت شاہ وصی اللہ (خلیفہ حضرت تھانوی) کی جماعت میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔

ل اس کتاب کی اشاعت سے قبل مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۷۷ء میں یہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انیس احمد عباسی

(متوفی ۱۹۷۶ء)

کسی زمانے میں مجھ سے چھوٹے تھے اور مجھ سے کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اسکول میں پڑھتے تھے تو اپنے ترجمے وغیرہ کی مشقیں دکھایا کرتے تھے! — اب مدت سے لکھنے والے برابر کی ٹکر کے ہیں اور ایک چھوٹے موٹے معاصر ہیں، ایک روزنامے کے بھی (گو بیچارہ برائے نام ہی سا ہے) کے ایڈیٹر۔

پرچہ کی پالیسی جو کچھ بھی کرڈی ہے۔ ذاتی طور پر مرنجان مرنج، صلح کل، نیک مزاج ہی تھے، اب بھی ہیں۔ نرم دلی شاید سِن کے تقاضہ سے اب اور پیدا ہو گئی ہے۔ غریبوں ناداروں کے ساتھ سلوک و امداد کی عادت اب کچھ بڑھ ہی گئی ہے — خود بھی جو کچھ بن پڑتا ہے، دیتے رہتے ہیں اور اس سے کہیں بڑھ کر دلواتے رہتے ہیں۔ باوجود اتنے کہنہ مشق اخبار نویس ہونے کے نعرے لگانے کے فن سے کورے ہیں اور نیشنلزم کا "فلک شگاف" نعرہ اگر لگا سکتے تو آج وزیروں، نائب وزیروں میں نہ سہی، تو کم سے کم راجیہ سبھا کے ممبر تو ضرور نامزد ہو گئے ہوتے، یہ بھی نہ سہی تو فلاں سوشلسٹ پارٹی یا فلاں کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ضرور ہی ہوتے!

غریبی سے بڑھے، غریبوں کو بھولے نہیں، انھیں مانتے ہیں، جانتے ہیں، پہچانتے ہیں۔ چھوٹے سے بڑے ہیں۔ اپنا وقت بھولے نہیں، چھوٹوں کو بڑھانا جانتے ہیں شرافت کی یہی پہچان ہے۔ کاکوری کا عباسی خاندان یوں بھی نسباً کسی سے ہیٹا نہیں۔

جنگ عظیم ۱۹۳۹۔۴۵ء کے زمانے میں "ہفتہ جنگ" اپنے اخبار میں محنت و توجہ

سے لکھتے رہے۔ جذبات و" افواہیات" سے زیادہ نظر واقعات و حقائق پر رکھے ہوئے۔ اور اونچے انگریزی روزنامے اسٹیٹسمین وغیرہ کے تبصرے پڑھ پڑھاکر خریدار ہزاروں کی تعداد میں نہ پیدا کر سکے، لیکن مٹھی بھر سنجیدہ خریداروں کے سامنے نیک نام اور کھرے رہے۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کے شریف گھرانوں کی گھریلو خبریں بھی اپنے اخبار میں خوب دے دیا کرتے ہیں، آج فلاں کے ہاں شادی ہوئی، آج فلاں کے ہاں غمی۔ اس کا سیوم ہوا، اس کا دسواں۔ ایک کے ہاں ختنہ ہوا، دوسرے کے ہاں عقیقہ۔ اس سے اخبار میں چہل پہل خوب پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی قدر کوئی لکھنؤ اور جوار لکھنؤ والوں کے دلوں سے پوچھے جنھیں باہر رہنا پڑتا ہے۔ سید جالب مرحوم کی رنگا رنگ صحافت کی یادگار قائم ہے تو انھیں شاگرد رشید کے دم قلم سے۔

پرانی تہذیب کے لُغت کا ایک بچا کھچا لفظ "وضع داری" اب تک چلا آتا ہے، اُسے یہ عملاً بھی نباہے چلے آتے ہیں۔ حفظ مراتب، مُروّت، اخلاص تینوں کے ڈانڈے اسی وضع داری سے ملے ہوئے ہیں۔

جوانی کے زمانے میں کچھ دنوں اپنے پرائیوٹ سکریٹری کا کام بھی انھیں سے لیا تھا چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جب اپنی شادی ہوئی تو اس کا مفصل تار انگریزی اخباروں میں انھیں سے شائع کرایا تھا۔ مولانا محمد علی اس وقت نظر بند تھے چھندواڑہ میں انھیں خبر اسی اخباری تار سے ہوئی تھی۔

۱۹۱۹ء کا غالباً اگست تھا جب ظفر الملک علوی کے پیسے اور ان کی محنت سے ایک ہفتہ وار پرچہ میری نگرانی میں حقیقت کے نام سے نکلا۔ یہ نام میرا ہی تجویز کیا ہوا تھا۔ خود یہ اس میں لکھنے لکھانے کا کام اچھا خاصا کرتا تھا۔ مولانا ابوالکلام وغیرہ بھی اس کے قدر دانوں میں ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں کے راستے الگ ہوتے گئے، چند مہینے کے بعد میں نے اپنا تعلق اس سے قطع کر لیا۔

اکثر اردو ایڈیٹروں کی طرح یہ بھی پڑھتے کم ہیں، لکھتے زیادہ ہیں۔ لکھتے لکھتے اور ایک عمر کی مشاقی سے قلم میں ایک طرح کی جلا، روانی اور شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ کاش مسلم لیگ کے حق میں بھی ان کا قلم انصاف کرنا سیکھ لے اپنے قلم ذات، کو چھوڑ کر صفات پر چلنے لگا۔ یہ بطور ایک خورد کے اور دوست کے بڑے قابل قدر ہیں، شرافت و وضعداری کے پتلے!

شادی اپنی کی، تو میری ایک قریبی رشتے کی سالی کے ساتھ، اس وقت سے باضابطہ وہ میرے عزیز بھی ہو گئے ہیں۔ میری ذات سے محبت اور بزرگ داشت کے علاوہ میرے خاندان والوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ رکھے ہیں۔ اور میرے بھائی مرحوم ڈپٹی عبدالمجید کے ساتھ تو علی الخصوص۔

اخبار کی زندگی عرصہ دراز سے برائے نام ہی چلی آتی تھی۔ ادھر خود بھی زیادہ علیل رہے، اور جوان و ہونہار داماد فرقت، کاکوروی کی مرگ ناگہاں سے قدرۃً بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔[1]

---

[1] افسوس اس کتاب کی اشاعت سے قبل مولانا کی زندگی میں انتقال کر گئے۔